مضامین فراق
حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی

ھو الناصر

مضامین فراق

از

حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق دہلوی جانشین خواجہ میر درد رح

مصنف

لال قلعہ کی ایک جھلک، دکن کی پری، درد جانستان
چار چاند، بیگموں کی چھیڑ چھاڑ، خوبصورت بھتنا
اور دیگر افسانے وغیرہ

ملنے کا پتہ
چمن اردو بکڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی
کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

قیمت
ایک روپیہ

(فہرستِ مضامین)

آفتاب نے شبنم سے کیا کہا؟

آخر چمن سے نکہتِ گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں اُلفت وطن کے ساتھ

جب صبح کے وقت شبنم آفتاب کے سلام کے لئے حاضر ہوئی۔ تو آفتاب نے کہا۔ کیوں ری ہرجائی، ہری چُگ تو رات بھر عالم سفلی کی سیر کرتی ہے۔ اور نت نئے تماشے دیکھتی ہے۔ مگر کبھی اپنے چھوٹے منہ سے ہمیں کوئی قصہ نہیں سُناتی۔

شبنم: ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں، جس کا ہاتھی اس کا ناؤں۔ کہیں جاؤں، کہیں آؤں کہلاتی آپ کی لونڈی ہوں۔ بھلا مجھے یہ "تاب و طاقت" ہے کہ حضور نیچے کی دنیا کا حال پوچھیں اور میں اُس کے بیان کرنے میں اغماض کروں؟ سنئیے جہاں پناہ! رات یہ آپ کی کنیز سیر کرتے کرتے آگرہ جانکلی۔ اور نواب والاجنگ آسماں کلاہ کے زنانہ محل میں داخل ہوگئی۔ یہ نواب جلال الدین اکبر شہنشاہِ ہندوستان کے درباری امیر ہیں۔ نواب صاحب کی محلسرا میں ایک چمن لگا ہوا ہے۔ چمن میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے درخت ہیں۔ مگر مجھے کیلے کی اُتو کٹی ہوئی سوزنی پسند آئی۔ میں اس پر چپکے سے جا لیٹی۔ کوئی رات کے گیارہ بجے اُس چمن کے پاس چار پانچ لونڈیوں نے اپنے اپنے پلنگ بچھا اس پر لیٹ گئیں۔ انسان کا قاعدہ ہے کہ بے بولے اس سے رہا نہیں جاتا۔ ان لونڈیوں میں جو بات چیت ہوئی وہ بہت دلچسپ تھی +

چنپا :- سچ کہنا بوا شام برن اس بچی کو کیا ہوا تھا۔ ہائے میرے اللہ گھڑی بھر میں بجس کر رہ گئی۔ کمبخت کھیلتی مالتی آغا مینا کی طرح باتیں ملکاتی اڑ گئی۔

شام برن :- بہن نیک قدم! ذرا بوا چنپا کی باتیں سُن رہی ہو کیا کہہ رہی ہیں۔ آٹے کے ساتھ گھن پسوانا چاہتی ہیں۔ کہیں جو کسی نے جا لگا یا کہ بڑی بیگم آپ کی صاحبزادی گل آرا بیگم کے مرنے کا حال شام برن چھوکری اس طرح کہہ رہی تھی تو بھلا بڑی بیگم میرا چونڈا اپنے مونڈے سے چھوڑیں گی؟

انجم :- اجی چونڈا منڈا کر چھٹکارا ہو جائے تو سستے چھٹے۔ نواب صاحب کے کان میں پڑ گئی تو ناک چوٹی کتروا کر تھوبے تیروں سے اڑا دیں گے۔ بس اس ذکر کو چھوڑو۔ بڑوں نے کہا ہے کہ دیوار بھی کان رکھتی ہے۔

چنپا :- اس وقت تو ہمارے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں ہے۔ ہم تو محل کے بیچوں بیچ میں چمن کے پاس اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے ہیں۔ بیگم صاحب اور نواب صاحب کوٹھے پر آرام کر رہے ہیں۔ نوکریں۔ چاکریں، ماما اصیلیں اِدھر اُدھر ہیں۔ سننے والے ہوں نہ ہوں، ہمارے تمہارے فرشتے ہوں، مگر فرشتوں کا یہ دستور نہیں کہ ہماری تمہاری طرح لگائی بجھائی کریں۔ اگر تم گل آرا بیگم کے مرنے کی حقیقت کہہ دوگی تو ہرج کیا ہے؟

شام برن :- چنپا! تو تو جھاڑ کا کانٹا بن کے لپٹ گئی۔ اری ناداں اس بچی کا نام لینے سے میرا دل دھڑکتا ہے۔ سات برس کی ہو کے آٹھویں میں پڑی تھی۔ جو موت نے اس کی منڈیا مروڑ لی۔ ہائے اس ناشاد نامراد کا اس طرح جان دینا سارے شہر کو برا لگا۔ سنا ہے جس وقت بادشاہ سلامت نے

یہ خبر سُنی تو بے اختیار رونے لگے۔ اور فرمایا۔ افسوس کن ارمانوں اور منتوں سے دارا جنگ کے گھر میں یہ لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ مگر کیا خبر تھی کہ وہ آناً فاناً چٹ پٹ ہو جائے گی۔ خیر تم کان لگا کر سنو۔ کھینچ کھینچ کر یہ قصہ میں نہیں کہوں گی۔ بات یہ تھی کہ ایک دن نواب صاحب ہوا دار میں سوار قلعہ سے گھر کو آ رہے تھے۔ بازار میں اُنہیں ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا ملا۔ اس نے سلام کر کے ترکی زبان میں کہا۔ میں طالب علم ہوں۔ اور توران سے آپ کے ملک میں پڑھنے آیا ہوں مگر میرے کھانے پینے کا بندوبست نہیں ہے۔ اگر آپ خدا راہ پر میرے کھانے کا انتظام کر دیں تو میری انتڑیاں آپ کو دعا دیں گی۔ اور آپ کو بڑا ثواب ملیگا نواب صاحب خود تورانی ہیں۔ اس لئے نواب صاحب کو اس لڑکے کی بات چیت بہت پسند آئی۔ اشارے سے کہا تم ہماری سواری کے ساتھ چلے آؤ۔ جب زنانی ڈیوڑھی کے پاس آئے تو فرمایا۔ لڑکے میاں تم ڈیوڑھی پر حاضر رہو۔ اور اندر آ کر بڑی بیگم سے فرمایا۔ ایک تورانی طالب علم بہت کم عمر اور بڑا گیگلا ہے۔ میں اُسے ساتھ لایا ہوں۔ اُسے خاصہ کا کھانا بھجوا دو۔ اور میں نے اُس سے کہہ دیا ہے۔ وہ روز ڈیوڑھی پر کھانا آ کر لے جایا کریگا۔ تم خود اس مسافر بیکس کے کھانے کا خیال رکھنا۔ ان لونڈیوں۔ اور پیر بخش دربان کے بھروسہ پر نہ چھوڑ دینا۔ بیگم نے کہا بہت اچھا۔ لڑکا آنے جانے اور کھانا لے جانے لگا۔ اور اس معاملہ کو کوئی چھ مہینے گزر گئے۔ گل آرا بیگم کی عمر ہی کیا تھی۔ وہ کھیلتے کھیلتے ڈیوڑھی میں پیر بخش دربان کے پاس چلی جایا کرتی تھیں۔ دو چار بار ایسا بھی ہوا۔ کہ گل آرا بیگم نے اس تورانی بچہ کو اور اُس نے گل آرا بیگم کو دیکھا۔ آج آٹھ دن

ہوئے۔ گل آرا بیگم نے ڈیوڑھی میں سے آکر بڑی بیگم سے کہا۔ اما جان تورانی لڑکا کھڑا ہے۔ اس کا کھانا بھجوا دیجئے۔ بڑی بیگم کو صاحبزادی کا یہ کہنا اچھا نہ لگا۔ انہوں نے میرے ہاتھ لڑکے کے لئے کھانا بھجوایا۔ اور مجھ سے کہا، اس لڑکے سے کہہ دینا تمہارا زنانی ڈیوڑھی پر آنا مناسب نہیں ہے۔ گھر بیٹھے تمہیں کھانا پہنچ جایا کرے گا۔ اب تم محل کے دروازہ پر نہ آنا۔ میں تورانی بچہ کو کھانا دے اور بیگم کی کہن اُس سے کہہ کر چلی آئی۔ اور اُس کا کھانا پیر بخش اُس کے پاس مسجد میں پہنچانے لگا۔ پرسوں گل آرا بیگم نے بڑی بیگم سے کہا۔ اماں جان لڑکا جو کھانا لینے آیا کرتا تھا۔ کیا بات ہے۔ کئی دن سے نہیں آیا۔ بڑی بیگم نے سیدھے سبھاؤ فرمایا۔ بیٹی! وہ لڑکا مرگیا۔ گل آرا نے کہا۔ اماں جان آپ یونہی فرماتی ہیں۔ یا وہ لڑکا سچ مچ مرگیا۔ بڑی بیگم نے کہا نہیں بیٹی میں یونہی نہیں کہتی ہوں۔ وہ لڑکا دراصل مرگیا۔ گل آرا بیگم نے پھر کوئی بات نہ دیکھی اور سیدھی اندر کے دالان میں جا اپنی چاندی کی پلنگڑی پر لیٹ گئی۔ اور دوشالہ اوڑھ لیا۔ بڑی بیگم نے فرمایا۔ خیر تو ہے۔ بیگی تم اس وقت پلنگڑی پر جا کر کیوں لیٹی ہو۔ گل آرا بیگم نے کہا اماں جان میں پلنگڑی پر مرنے کے لئے لیٹی ہوں۔

بڑی بیگم نے کہا :- اوئی نوج دشمنوں بیری۔ سات قرآن درمیان تم کیا کہہ رہی ہو؟

گل آرا بیگم :- اماں جان میں سچ کہتی ہوں جب وہ لڑکا مرگیا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ اس بات کے ساتھ ہی گل آرا نے ایک ہچکی لی۔ اور اُس کا دم

آخر ہو گیا ۔ بڑی بیگم نے ایک چیخ ماری اور ان کی چیخ کے ساتھ سارا محل اکٹھا ہو گیا۔

نواب صاحب دوڑے آئے بادشاہی حکیم بلائے گئے ۔ اور انہوں نے اس کو دیکھ بھال کر کہا ۔ اس معصومہ کے دل کو کوئی صدمہ پہنچا جس نے اس کی روح کو تحلیل کر دیا ۔ نہ اسے سکتہ ہے نہ جمود ہے ۔ یہ تو میت ہے ۔ گورستان میں لیجائیے ۔

محل میں کہرام مچ گیا ۔ قیامت برپا ہو گئی ۔ اس محبت کو خدا دنیا سے غارت کرے ۔ بھلا کوئی سمجھدار ہوشیار ہو تو اس پہ الزام بھی لگایا جائے ۔ یہ تو منہ بند کلیوں کے گلے گھونٹتی ہے ۔ اُٹھتے پودوں کو تلووں سے مل ڈالتی ہے ۔ نرم نرم کونپلوں کو توڑ مروڑ کر پھینکدیتی ہے ۔ یہ ساری آفت کنگھی اور آئینہ نے ڈھائی ہے ۔ بھلا کہئے جب مشاطۂ زلف میں عطر خنا ڈالے اور اس کو بنائے سنوارے تو قیس و فرہاد کا کیا قصور ہے ؟ پتھر کا انسان ہو تو جلتا نہ بچے ۔

گھڑا یہ غضب زلف سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

جزیرۂ مالٹا کے ۲ پھول

دل آشفتگان خالِ کنجِ دہن کے

سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں

جزیرۂ مالٹا فی زمانہ اس سبب سے مشہور ہے کہ یورپ سے ہندستان آنے جانے والے جہازوں کا بندرگاہ ہے۔ اس پر گورنمنٹ عالیہ برطانیہ کا قبضہ ہے۔ دراصل مالٹا جزائر کے مجموعہ کا نام ہے۔ جس میں گوزو و کومینو وغیرہ وغیرہ چھوٹے ٹاپو شامل ہیں۔ مالٹا کا شمالی خط عرض البلد ۳۵ درجہ ۵۳ ثانیہ ۴۹ دقیقہ اور اُس کا شرقی طول البلد ۱۴ درجہ ۳۰ ثانیہ ۲۸ دقیقہ ہے۔ باشندوں کی زبان عربی اور اٹالی ہے۔ یہ جزیرہ بہت شاداب ہے۔ اس میں رنگترے۔ انگور۔ انجیر قابل پسند ہوتے ہیں۔ اس کے ایک باغ میں ۸۰ فٹ لمبے سرو آزاد ہیں۔ جنہیں دیکھ کر سیاح حیران ہو جاتا ہے۔ زراعت بھی یہاں خوب ہوتی ہے انگریزی حکومت کے سبب سے اس وقت مالٹا گل و گلزار ہے۔ مگر اب سے ایک ہزار برس پہلے یہ جزیرہ برائے نام آباد تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں جہاز رانی کا فن یورپ میں بہت کم تھا۔ بادی جہاز چلتے تھے۔ اس واسطے ہر جزیرہ بندرگاہ نہ تھا۔ اور نہ جزیروں کی اُس زمانہ میں قدر و

قیمت تھی ❖

مالٹا جین ڈی نام ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کے رہنے والے عیسائی تھے۔ جین ڈی سے باہر مغرب کی طرف چار فرلانگ کے فاصلہ پر ایک گرجا تھا۔ اور گرجا کے قریب اس کے متولی پادری جے۔ اے رانبن مع اپنے اہل و عیال کے ایک حویلی میں رہتے تھے۔ اس گرجا میں اتوار کے دن صبح اور شام کے وقت نماز ہوتی تھی۔ اور قصبہ کے رہنے والے حسب تقاضہ کرتے تھے۔ تو پادری صاحب وعظ بھی کہدیا کرتے تھے۔ قصبہ جین ڈی کے شرقی جانب سمندر کے کنارے آبادی سے ایک میل پر ایک بنگلہ میں میجر میکس ملر مع اپنے بال بچوں کے بستے تھے۔ میجر میکس ملر کے پردادا فرانس کی ایک فوج میں میجر تھے۔ اور اسی سبب سے میکس ملر کے باپ دادا اور خود میکس میلر میجر کے لقب سے مشہور تھے۔ میجر صاحب کی بیوی بڑی نیک عورت تھیں تیس برس کی عمر تک ان کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ مگر جب پادری جے اے رانبن سے انہوں نے رجوع کی۔ تو ان کی دعا سے خدا نے ایک لڑکا اور ایک لڑکی عنایت فرمائی۔ لڑکا لڑکی سے بڑا تھا۔ اور اس کا نام پادری صاحب نے کیلی رکھا تھا۔ کیلی کی بہن کا نام گل ❖

کیلی پندرہ برس کا، اور مس گل تیرہ برس کی ہو گئی۔ دونوں بہن بھائی۔ گلعذار۔ گلرو۔ گلبدن۔ غنچہ دہن تھے۔ میجر صاحب کا بنگلہ جس پشتہ پر واقع ہوا تھا۔ اس کے نیچے ہی سمندر بہتا تھا۔ اور چاندنی رات میں سمندر کا نظارہ اس بنگلہ سے طلسماتی بہار دکھایا کرتا تھا۔ مگر دسمبر جنوری کی ٹھنڈی

ہوائیں۔ جب سمندر سے گزر کر بنگلہ میں آتی تھیں۔ تو اس وقت بنگلہ کے رہنے والوں کو تکلیف پہونچتی تھی۔ گاہ بہ گاہ میجر صاحب کے بنگلہ سے کچھ دور سمندر میں بادبانی جہاز لنگر ڈال کر ٹھہرے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے۔ بنگلہ سے تین فرلانگ پر میجر صاحب کے باغ اور کھیت تھے۔ اور ان باغوں اور کھیتوں کی پیداوار پر ہی میجر صاحب اور اُن کے گھرانے کا گزارہ تھا۔

میجر صاحب کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔ مگر اُن کے صاحبزادے کیلی کو اُن سے بھی زیادہ کتے پالنے کا شوق ہوا۔ نوجوان کیلی نے دو قوم دار کتے پالے۔ مگر ایک مگرمچھ رات کے وقت بنگلہ کے غلام گردش میں آ کر اُن دونوں کا دو بار میں نوالہ کر گیا۔ مگرمچھ۔ گھڑیال اور اس قسم کے دریائی جانوروں کو کتے کا گوشت بہت پسند ہے۔ اور وہ ادبدا کر کتوں کا شکار کرتے ہیں کیلی کے ایک کتے کا نام کرپ اور دوسرے کا نام جیک تھا کیلی اور میجر صاحب کو کتوں کے تلف ہو جانے کا بڑا رنج ہوا۔ ایک دن میجر صاحب نے مگرمچھ کو سمندر کی سطح پر پاکر بندوق بھی سر کی مگر اس ڈھیٹھ پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ایک دن میجر صاحب کے ایک دوست کا رقعہ قصبہ جین ڈی سے اس مضمون کا آیا کہ پیرس سے جناب بشپ صاحب تشریف لائے ہیں اور پادری جے۔ اے کے دولت خانہ پر قیام فرمایا ہے۔ بعد غروب آفتاب گرجا میں مذہب پاک پر لیکچر دیں گے۔ امید ہے کہ آپ اور آپ کی اہلیہ بھی بشپ صاحب کی زیارت اور اُن کی تقریر سے بہرہ یاب ہونگے ۔

مس گل :۔ اماں جان! میں بھی آپ کے ساتھ گرجا چلوں گی۔ اور بشپ

صاحب کے جوتے کو بوسہ دوں گی۔

مس گُل کی ماں :- نہیں بیٹی! تم اور تمہارا بھائی کیلی گھر میں رہے گا۔ اور میں اور تمہارے بابا گرجا جائیں گے۔

مس گُل :- واہ۔ بی اماں! آپ خوب ہیں، ہم اور بھائی تو گھر میں پڑے سڑا کریں۔ اور آپ جا کر بشپ صاحب کی قدمبوسی کریں۔ یہ تو خدا یوں بھی نہ ہو گا (یہ کہہ کر مس گل رونے لگی)

کیلی :- بہن تم رو نہیں۔ تم اور اماں جان اور ابا شوق سے گرجا تشریف لے جائیں۔ میں اکیلا گھر میں رہوں گا۔

میجر صاحب :- ہاں ہاں! کیلی تم بنگلہ میں رہو۔ تمہاری بہن ہمارے جانے میں بھی کھنڈت ڈالے گی۔

:-(۲):-

میجر صاحب مع اپنی میم صاحبہ اور مس صاحبہ کے عصر کے وقت قصبہ جبن ڈی میں پہنچ گئے۔ تاکہ سب دوستوں کے ساتھ گرجا میں حاضر ہوں۔ آفتاب غروب ہونے کے بعد کیلی نے السی کے تیل کا لیمپ روشن کر کے بڑے کمرے کی میز پر رکھا۔ اور وہ ایک قلمی تاریخ کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔ اور اُس کا کتا جس کا نام تندر اور قوم کا ٹی تھا۔ اس کی کرسی کے نیچے بیٹھا تھا، رات کے نو بج گئے مگر میجر صاحب گرجا سے واپس نہ آئے۔ کیلی کو اس کا خیال بھی آیا مگر اس کے دل نے کہا۔ "بشپ صاحب کی لمبی چوڑی تقریر ابھی ختم نہ ہوئی ہو گی۔ اور یہی وجہ بابا کے آنے کی تاخیر کی ہے" اور وہ کتاب کے مطالعہ

میں پھر ڈوب گیا۔ دفعتاً اس کے کان میں آدمی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ اور اس نے دیکھا۔ پادری جے۔ اے۔ رابنسن صاحب کی لڑکی۔ جس کی عمر سترہ سال کی اور نام کلفرڈ تھا۔ ہانپتی کانپتی کمرہ میں آئی۔ اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا "کیلی خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔ چور، بدمعاش مجھے جیتا نہیں چھوڑینگے۔"

کیلی:۔ تم اس وقت کہاں؟

مس کلفرڈ:۔ بابا نے مجھے گاؤں بھیجا تھا۔ جو یہاں سے پانچ میل ہے" تاکہ میں ایک زمیندار سے سو روپے وصول کر کے لاؤں۔ جو اس نے بابا سے قرض لئے تھے۔ اور آج ان کے دینے کا وعدہ تھا۔ میں گاؤں گئی مگر وہ زمیندار نہ ملا اور مجھے اس کا انتظار کرتے کرتے گاؤں میں شام ہو گئی۔ بارے وہ سات بجے رات کے آگیا۔ اور اس نے سو روپے گن میرے حوالہ کئے۔ اس نے مجھے روکا کہ صبح چلی جانا۔ مگر میں نے کہا کہ بابا ساری رات پریشان رہیں گے۔ میں ایک گھنٹہ میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گی۔ یہ کہہ کر میں گاؤں سے چل دی۔ گاؤں کے بدمعاشوں نے تاڑ لیا کہ مس کلفرڈ روپیہ لے کر جاتی ہے۔ چپکے سے میرے پیچھے ہو لئے۔ تاکہ میں جب جنگل میں پہنچوں تو روپیہ لوٹ کر لے جائیں۔ میں سر پر پاؤں رکھکر بھاگی انہوں نے مجھے آلیا۔ اور ان میں سے ایک بدمعاش نے چلا کر کہا:۔ "اگر اپنی جان اور آبرو سلامت لے جانا چاہتی ہے تو روپیہ ہمیں دے جا۔ نہیں اسی میدان میں ہم تجھے مار کر دبا دیں گے" ناگہاں مجھے آپ کے بنگلہ کا جلتا ہوا لیمپ نظر آیا۔ اور مجھے یاد آگیا کہ یہ میجر صاحب کا مکان ہے۔ اور مجھے اس میں پناہ ملے گی۔ اس لیئے میں بے تحاشا بھاگی، اور یہاں تک آگئی۔

یہ باتیں مس کلفرڈ نے ختم ہی کی تھیں۔ جو پانچ آدمی بدصورت، دراز قد، بنگلہ کے کمرے میں داخل ہوئے۔ کیلی میجر میکس ملر کا بیٹا تھا اس نے تلوار اٹھانی چاہی، مگر بدمعاشوں نے اس بے گناہ کو ایک مارنے کی مہلت نہ دی۔ اور اس کے گلے میں تانت کا پھندا ڈال کر زور سے کھینچا اور ایک آن کی آن میں وہ بے جان ہو کر زمین پر گرا۔ کیلی کو مرتا دیکھ کر مس کلفرڈ کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ بھی دھڑام سے زمین پر گری۔ خدا جانے مری یا زندہ رہی۔ مگر بدمعاشوں نے اس کے اور کوٹ میں سے نوٹ روپے نکال لئے۔ اور چمپت ہو گئے۔ کیلی کے وفادار کتے نے اُن کا پیچھا کیا۔ اور وہ بھی بدمعاشوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ سمندر کے مگرمچھ نے جو کیلی کے دو کتے کھا چکا تھا۔ بنگلہ میں سناٹا پایا تو وہ چپکے چپکے بنگلہ میں آیا۔ اور اس نے لیمپ کی روشنی میں کیلی اور کلفرڈ کی لاشیں زمین پر پڑی پائیں، یہ لاشیں اس کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھیں۔ دونوں کو فوراً نگل گیا۔ اور سمندر میں جا کودا۔

❊(۳)❊

رات کے دس بجے بشپ صاحب کا لیکچر ختم ہوا۔ اور میجر صاحب میم صاحبہ اور مس گل کو لے کر گیارہ بجے بنگلہ میں آئے۔ دیکھا کہ لیمپ کی بتی بھڑک رہی ہے سارے کمرے میں ایک قسم کا سناٹا ہے۔ اور کیلی نہیں ہے۔ میجر صاحب اور اُن کی میم صاحبہ کو سخت حیرانی ہوئی۔ کہ اس وقت بچہ کہاں چلا گیا۔ خواب گاہ کے کمرہ میں بلکہ بنگلہ کے چپہ چپہ میں کیلی کو ڈھونڈا۔ آوازیں دیں۔ چیخے چلائے۔ مگر کیلی اس عالم میں تھا کب، جو انہیں مل جاتا۔ یا اُن کی بات کا جواب دیتا۔ ساری رات تشویش میں گذری۔ صبح ہوتے ہی میجر صاحب نے اپنے باغ کے اور کھیت کے

نمبروں کو بلا کر چاروں طرف کیلی کی جستجو میں بھیجا۔ خود جین ڈی کو آئے تاکہ لوگوں سے تذکرہ اور مشورہ کریں۔ قصبہ میں پہنچکر معلوم ہوا کہ پادری صاحب کی اکلوتی بیٹی کلفرڈ جو گاؤں سے قرض کے روپے لینے گئی تھی۔ رات سے غائب ہے۔ میجر صاحب کو یہ بھی خیال آیا کہ رات سے کتا بھی نہیں ہے۔ کئی مہینے پادری صاحب اور میجر صاحب نے اپنے نور نظر بچوں کی تلاش کی۔ اور سارے جزیرے کو تلپٹ کر ڈالا۔ مگر ان غریبوں کا پتہ نہ چلا۔ اور پتہ کیونکر لگتا۔ اگر اس واردات کو کہتے تو میجر صاحب کے بنگلہ کے در و دیوار یا لیمپ کی بتی۔ جن کے سامنے چوروں نے ان دونوں کو مارا۔ اور مگر مچھ نے نگلا۔ مگر یہ سب چیزیں بے زبان تھیں۔ کیونکر کہہ سکتی تھیں۔ میجر صاحب اور پادری صاحب کا گھرانہ برسوں کیلی اور کلفرڈ کو روتا رہا۔ مگر انسان کا نازک دل غم سہتے سہتے پتھر بھی بنجاتا ہے اس لئے اب ان لوگوں کو صبر آنے لگا۔ اور کیلی اور کلفرڈ کی یاد کم ہونے لگی۔ وقت گزرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ کیلی اور کلفرڈ کو ناپید ہوئے سات برس ہو گئے میجر صاحب بڑے تنومند آدمی تھے۔ مگر کیلی کے داغ نے اُن کی کمر توڑ دی۔ ماں بیچاری کو آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگا۔ اور پادری صاحب اور اُن کی بیوی کلفرڈ کے غم میں گھل گئے۔ مصیبت کے وقت خدا زیادہ یاد آتا ہے اس واسطے میجر صاحب اور ان کی بیوی اتوار کے دن دونوں نمازوں کو قضا نہ کرتی تھیں۔ اور قربانگاہ کے سامنے حاضر ہو کر کیلی سے ملنے کے لئے دعا کیا کرتی تھیں۔

ایک اتوار کو میجر صاحب اور اُن کی میم صاحبہ اور مس گلی گرجے میں حاضر

تھیں۔ نماز ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ کہ ناگہاں دو اجنبی آدمی گرجا میں داخل ہوئے۔ ایک مرد اور ایک عورت، دونوں کے دونوں اپنا منہ چھپائے ہوئے تھے۔ وہ جلدی سے پادری صاحب کی کرسی کے پاس پہنچے۔ پادری صاحب حیران تھے کہ یہ کون ہیں، اور اس بیباکی سے میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ جوان میں سے مرد نے اپنا منہ کھول کر پادری صاحب کے قدموں کو بوسہ دیا اور چلّا کر کہا کہ یہ آپ کی صاحبزادی مس کلفرڈ ہیں۔ انہیں اپنی آنکھوں میں جگہ دیجئے

پادری صاحب نے کہا۔" اور نوجوان تم کون ہو"

نوجوان:۔ میرا نام کیلی ہے۔ اور میں آپ کے دوست میجر میکس ملر کا بیٹا ہوں

مس کلفرڈ نے اپنے بوڑھے باپ کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور اُدھر سے کلفرڈ کی ماں نے آکر اپنی بچی کو گلے سے لگا لیا۔ میجر صاحب اور ان کی بیم صاحبہ کو بھی تاب نہ ہوئی۔ یہ بھی سب کیلی سے لپٹ گئے۔

قصبہ جین ڈی کے سب باشندوں کو ان گم شدہ کمسنوں کے ساتھ اُلفت تھی۔ اور اُن کے غائب ہو جانے کا قلق رکھتے تھے۔ ان کو سلامت دیکھکر اُن لوگوں نے خوشی کے نعرے اس زور سے مارے کہ گرجا کا ہال گونج اٹھا۔ تعجب ہے کہ والدین اپنے بچوں کو دیکھ شادی مرگ کیوں نہ ہو گئے۔ نماز بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ قصبہ کے مرد و زن جو حاضر تھے اس خبر کو سُنکر وہ بھی دوڑے چلے آئے۔ اور سارا گرجا آدمیوں سے بھر گیا۔ اور عوام الناس نے کہا۔" مسٹر کیلی ہم تمہیں گرجا سے اُس وقت تک قدم نہیں نکالنے دینگے جب تک تم اپنے غائب ہونے کا حال مفصل نہ سُنا دو گے"

؛؛ (۴) ؛؛

کیلی :- اس طور پر رات کے نو بجے مس کلفرڈ ہمارے بنگلہ پر آئیں۔ اور وہ حال کہہ رہی تھیں، جو بدمعاش بھی بنگلہ میں گھس آئے۔ اور انہوں نے میرے گلے میں پھانسی ڈالدی۔ اور مس کلفرڈ بھی اس صدمہ کو دیکھ کر بیہوش ہوگئیں جب مجھے اور مس کلفرڈ کو ہوش آیا۔ تو ہم نے اپنے تئیں ایک جہاز کے کمرے میں پایا۔ اور جہاز کے کپتان کی زبانی معلوم ہوا کہ ہمارے بنگلہ سے کچھ دور اسی شب کو اس جہاز نے تھوڑی دیر کے لئے لنگر ڈالا تھا۔ اور کچھ ملاح صبح کے قریب قضائے حاجت کے لئے کشتی میں بیٹھکر کنارہ پر گئے تھے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک گرمچھ زمین پر پڑا ہے۔ اور کچھ بے چین ہے۔ یکایک اس نے استفراغ کیا۔ اور اس استفراغ میں ایک آدمی اس کے منہ سے نکل کر زمین پر گرا۔ پھر دوسرے استفراغ میں دوسرا آدمی اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ ہلکا ہوکر سمندر میں بھاگ گیا۔ ملاح ان دونوں آدمیوں کو کشتی میں لاد کر جہاز میں لے آئے۔ اور وہ دونوں آدمی تم دونوں زن و مرد تھے۔ مجھے ڈاکٹری میں بھی دخل ہے۔ میں نے تمہاری تیمارداری کی۔ اور خدا نے تمہیں دوبارہ زندگی بخشی۔

ہم نے کپتان صاحب کی اس مہربانی کا بڑا شکریہ ادا کیا۔ رفتہ رفتہ مجھے خیال آیا کہ وہ مگرمچھ جو ہمارے بنگلہ کے نیچے سمندر میں رہتا ہے۔ اور کتوں کا خون اس کے منہ کو لگ گیا ہے اس شب کو بنگلہ میں آیا ہوگا اور ہمیں مردہ سمجھ کر نگل گیا ہوگا۔ مگر ہمارا ڈیل ڈول اس سے ہضم نہ ہوا ہوگا۔ اور ہمیں اس نے اگل دیا ہوگا۔ اور یہ لوگ اپنے جہاز میں ڈال کر روانہ ہوگئے ہونگے

کپتان صاحب ہم پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اور اچھی اچھی غذائیں ہمیں کھلاتے تھے۔ مگر ہم سے جہاز کے ایک نوکر نے کہا: "کپتان صاحب تم دونوں کی خاطر مدارات اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ تم دونوں گورے چٹے ہو۔ اور اس قسم کے غلام اور لونڈیوں کی قسطنطنیہ میں زیادہ قدر و قیمت ہے۔ تم بیچے جاؤ گے۔"

جب مجھے اور مس کلفرڈ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ تو ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور مس کلفرڈ نے کہا۔ "اس لونڈی بننے سے میں اپنا مرنا اچھا جانتی ہوں۔ میں تو سمندر میں کود کر اپنی جان دوں گی۔" میں نے کہا۔ تم سمندر میں گرو گی تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔ اور صلاح کر کے ہم نے دریا میں ڈوبنے کا دن مقرر کر لیا۔ اور موقعہ پا کر ہم دونوں کے دونوں ایک رات کو دریا میں گر گئے اس رات کو دریا میں طوفان تھا۔ مگر وہ طوفان ہمارے لیے رحمت ہو گیا۔ ہمارے گرنے کے ساتھ ہی دریا میں ایک موج اٹھی۔ اور اس نے ہم دونوں کو سمندر کے کنارہ پر پھینکدیا۔ زمین کو دیکھ کر ہم خوش ہوئے۔ اور سمجھے کہ یہاں کے رہنے والوں سے ہم اپنی مصیبت کہیں گے۔ اور وہ ہمیں ہمارے وطن پہنچا دینگے مگر جب ہم چلے پھرے تو معلوم ہوا کہ ویران جزیرہ ہے۔ مگر خود رو میوے انار انگور۔ سیب۔ بہی۔ امرود۔ ناشپاتی۔ بادام۔ خوبانی تر و خشک درختوں میں لدے رہتے تھے۔ شیریں چشمے جاری تھے۔ ہم خدا کا شکر بجا لاتے اور میوا کھا کھا کر زندگی کے دن کاٹتے۔

دو برس میں ہمارے تن کے کپڑے پرزہ پرزہ ہو گئے۔ اور ہمیں اپنے ننگے ہو جانے کا اندیشہ ہوا۔ ایک دن جو ہم سمندر کے کنارے پہنچے تو ہم نے

دیکھا۔ سمندر میں مردے بہے چلے آتے ہیں۔ کفن کے لالچ سے میں دریا میں کودا۔ اور مردوں کی ٹانگ پکڑ پکڑ کر کنارے پر لایا۔ اور اب معلوم ہوا کہ وہ سپاہیوں کی لاشیں ہیں۔ جو کسی بحری لڑائی میں مارے گئے ہیں۔ اور جہاز والوں نے انہیں مع وردی سپرد دریا کر دیا ہے۔

میں نے اور مس کلفرڈ نے ان مردوں کے بدن سے کپڑے اتار لئے دو پانچ برس تک ہم ان کے ہی لباس سے اپنی تن پوشی کرتے رہے۔ اس جزیرے میں پڑے پڑے ہم گھبرا گئے۔ مگر کوئی صورت رہائی کی پیدا نہ ہوئی۔

ایک دن ہم ساحل پر بیٹھے تھے۔ جو دریا میں ہمیں ایک لائف بوٹ دکھائی دی۔ جو دھکے کھاتی چلی جاتی تھی۔ اور اس میں کوئی سوار نہ تھا۔ میں فوراً دریا میں کودا۔ اور اس کشتی کو جا پکڑا۔ اور جس طرح ممکن ہوا اُسے کنارے پر لایا۔ اس میں دو تین رسیاں بھی مل گئیں۔ میں نے ایک رسی دوسری رسی سے جوڑ کر اور کشتی کے تلابہ میں باندھ کر کشتی کو ایک درخت سے باندھ دیا۔ جو ساحل کے قریب تھا۔ غالباً کوئی جہاز دریا میں غرق ہوا تھا۔ اور یہ کشتی اس سے الگ ہو کر چلی آئی تھی۔

مس کلفرڈ نے کہا کیلی یہ خدا نے ہمیں اس جزیرہ سے نکالنے کا سامان کیا ہے۔ اب دیر نہ کرو۔ اور کل صبح ہی سوار ہو کر چل دو۔ کیا عجب ہے کہ اسی طرح دل کھول کر ہم لوگ وطن پہنچ جائیں۔ ہم نے شاموں شام کئی من تر و خشک میوے لا کر کشتی میں لاد دیئے۔ مگر پانی کے لیئے کوئی ظرف نہ تھا اس لیے

شیریں پانی کشتی میں نہ رکھ سکے۔ اور دوسرے دن خدا کا پاک نام لیکر ہم کشتی میں سوار ہو گئے اور کشتی کو اسی کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ آج تین مہینہ کے بعد ہماری کشتی اس جزیرہ مالٹا میں پہنچی ہم خدا کا شکر بجا لائے معلوم ہوا کہ آج اتوار کا دن ہے۔ اسی لئے ہم دونوں کشتی سے اتر کر بھاگا بھاگ گرجا میں آئے تاکہ ہماری نماز قضا نہ ہو۔ جب کیلی نے اپنی داستان ختم کی تو پھر خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔

پادری صاحب:۔ بیٹی کلفرڈ! آسمانی باپ رحیم و کریم بھی ہے۔ اور جبار و قہار بھی ہے۔ سچ بتا تو نے اس تنہائی میں اپنی عصمت پر تو حرف نہیں آنے دیا۔

مس کلفرڈ۔ بابا گناہ نہیں چھپا کرتا۔ آپ آسمانی باپ کے نائب ہیں کیا آپ مجھ میں کوئی گناہ کی علامت پاتے ہیں۔

پادری صاحب:۔ میں تو تیرے چہرہ پر وہی بھولا پن پاتا ہوں جو ایک کنواری پارسا کی شکل پر ہوا کرتا ہے۔ مگر کیا عجب ہے کہ مجھ سے زیادہ آنکھوں والا اس ہجوم میں ہو اور وہ تیرے حق میں کچھ اور فیصلہ کرے۔ پادری صاحب یہ کہہ رہے تھے جو تمام مخلوق نے چلا کر کہا "بیشک مس کلفرڈ اور کیلی پاک ہیں اور ان کی پاکیزگی ہی انہیں ان آفتوں سے بچا کر ہمارے سامنے لائی ہے مگر مائی لارڈ اب آپ ہمارے سامنے کلفرڈ کا نکاح کیلی سے کر دیجئے۔

پادری صاحب:۔ میں پنچوں کے کہنے سے سرتابی نہیں کر سکتا۔

اسی وقت مسٹر کیلی کا نکاح کلفرڈ سے ہو گیا۔ اور قصبہ والوں نے مل کر میجر صاحب اور ان کی بیوی کو بیٹے اور بہو کے پانے کی مبارکباد دی۔ اور خدا نے میجر صاحب کا بنگلہ پھر آباد کر دیا۔ ✣

مرگھٹ کی دیوی

کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش ششش جہت انتظار ہے

سونا ڈیہ جگنا، میرا ایک گاؤں ہے۔ جو بھگوان پور پرگنہ چین پور ضلع آرہ میں واقع ہے۔ یہ گاؤں ٹھیکہ پر دیدیا گیا ہے۔ اور روپیہ وصول کرنے کی غرض سے مجھے ہر سال یہاں آنا پڑتا ہے۔ سونا ڈیہ، بھگوان پور سے تین میل ہے۔ میں داروغہ بلدیو نراین صاحب متوفی کے مکان پر قیام کرتا ہوں۔ داروغہ صاحب کی اولاد اور ان کے خاندان کے سب چھوٹے بڑے میرے ساتھ بہت ادب و لحاظ سے پیش آتے ہیں۔ شب کو جب میں کھانے پینے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو جاتا ہوں۔ تو ترنت پرشاد صاحب داروغہ صاحب کے فرزند ارجمند وغیرہ سب مجھے آ کر گھیر لیتے ہیں۔ اور میری ویدانت اور حکمت کی باتوں کو سن کر بہت لطف حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ آج اپریل کی دسویں شب کو کچھ آسیب اور بھوتوں کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا۔ چنار ضلع مرزا پور میں میرے ایک دوست کرمفرما خواجہ سید حسین علی صاحب اپنے قصبہ کے رئیس زادہ ہیں وہ فرماتے تھے کہ میں ضلع مین پوری میں جو کلکتہ کی طرف ایک مشہور مقام ہے کوتوال تھا۔ ایک روز میں کوتوالی میں بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا جو چندن پور کے

چوکیدار نے آکر کہا۔ چندن پور کی حد میں ایک واقعہ ہوگیا ہے۔ آپ موقعہ پر تشریف لے چلئے۔ جب چوکیدار کوتوالی میں پہنچا۔ تو اس وقت دن کے تین بجے تھے۔ چندن پور کوتوالی سے چھ سات میل کے فاصلہ پر تھا۔ ایک جمعدار اور چار کانسٹبل فوراً چندن پور کو روانہ کئے۔ اور ان سے کہا میں بھی آتا ہوں میرا گھوڑا آٹھ سو روپیہ کی قیمت کا برق رفتار تھا۔ کچھ دیر بعد میں اس پر سوار ہوکر چلا۔ شام کے چار بج رہے تھے میں تھوڑی دیر میں چندن پور کے قریب پہنچ گیا۔ راستہ تنگ تھا اور دورویہ تھوہر کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس پگ ڈنڈی سے ادھر میں نے دیکھا کہ چند آدمی کھڑے ہیں۔ اور نشیب میں ایک چتا بنی ہوئی ہے اور ایک لاش جلائی جاتی ہے۔ میں نے گھوڑا روک کر ان لوگوں سے پوچھا کہ کون مرگیا۔ لوگوں نے کہا کہ فلاں برہمن کا لڑکا ہیضہ میں مبتلا ہوا اور چند ہی گھنٹہ میں مرگیا ہمارے چندن پور میں آجکل ہیضہ کا زور ہے۔ اس نوجوان کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہ تھی۔ میں سنتا ہوا چل دیا۔ موقع واردات پر پہنچا اور وہاں سے پلٹ کر چندن پور میں ٹھیرا اور معاملہ کی تفتیش کی۔ اور اپنے ساتھی کانسٹبلوں اور جمعدار سے کہا۔ تم چلو اور ڈاک بنگلہ میں ٹھیرو۔ اور کھانے پینے کا سامان گاؤں سے لیتے جاؤ۔ یہ لوگ ڈاک بنگلہ کو چلتے ہوئے اور میں چندن پور کے زمینداروں سے بات چیت میں لگ گیا۔ اور بیٹھے بیٹھے رات کے نو بج گئے چودھویں تاریخ چاند کی تھی۔ اور برسات عنقریب ختم ہو چکی تھی۔ اس لئے چاندنی بہار دے رہی تھی۔ میں دس بجے رات کے چندن پور سے چلا۔ چاندنی کوسوں تک پھیل رہی تھی۔ اور آنکھوں سے لے کر کلیجہ تک اس کی ٹھنڈک اتری چلی جاتی تھی۔ جب میں اس مرگھٹ کے قریب پہنچا۔ جہاں برہمن

بچے کی لاش جلائی جاتی تھی۔ تو میں نے اپنے مرکب کو بے چین پایا۔ وہ تیزی کرنے لگا۔ اور چاہتا تھا کہ میں جلد نکل جاؤں۔ یکایک میری نظر اس نشیب تک گئی جہاں نوجوان پھونکا گیا تھا۔ تو میں نے دیکھا کہ اس نشیب کے کنارہ پر ایک عورت سفید پوش کھڑی ہے۔ اس کا لباس بہت ہی براق ہے۔ عورت کے سر کے بال بھونرا جیسے سیاہ ہیں۔ اس کا چہرہ آبداری اور حسن میں پورنماشی کے چاند کو مات دے رہا ہے۔ اس کے پاؤں جو ساڑی سے نکل رہے ہیں۔ وہ ستاروں کی طرح روشن ہیں۔ وہ عورت رستہ سے پیٹھ موڑے کھڑی ہے۔ اور برہمن بچہ کی جلی ہوئی ہڈیوں کو غور سے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس عورت کے سراپا کو شوق کی نظر سے دیکھنا چاہا۔ اس لئے میں نے گھوڑے کی باگ روکی۔ مگر گھوڑا پارہ کی طرح تڑپنے لگا۔ عورت کے حسن و جمال کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ اس سے بات کروں۔ اور میں نے پکار کر کہا۔ بیوی تم کون ہو اور اس خطرناک جگہ تم کیوں کھڑی ہو۔ مگر عورت نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسی طرح میں نے کئی بار اُسے پکارا۔ اور اُس نے دھیان نہ کیا۔ اب مجھے طیش آیا۔ اور میں نے حکومت کے لہجہ میں کہا:۔ تو بڑی ڈھیٹ ہے۔ کیوں نہیں بولتی؟ اس عورت کو اب بھی خبر نہ ہوئی اور اس مرے ہوئے برہمن کی چتا کو گھورتی رہی۔ اس عرصہ میں میرا گھوڑا بہت گھبرایا۔ ایک دفعہ وہ الف ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں اُبل آئیں۔ اُس کے نتھنوں اور منہ سے جھاگ اڑنے لگے۔ مجھے بھی ضد آپڑی اور میں نے چاہا۔ اس عورت کو پکڑ کر سزا دوں۔ اس لئے میں نے ہنٹر سنبھالا۔ کہ

مغرور عورت کے کولہوں پر ٹکا دوں۔ مگر اب مجھے خیال ہوا کہ غالباً یہ عورت انسان نہیں ہے۔ بلکہ چڑیل یا بلا ہے۔ اس تصوّر کے آتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں نے اپنے ہاتھ پاؤں میں منوں کا بوجھ پایا۔ اب مجھ میں اتنا سکت نہ رہا کہ گھوڑے کی باگ موڑوں۔ مگر میری کمزوری سے باگ ڈھیلی ہو چلی تھی۔ اس لئے گھوڑا شرارۂ آتش بن گیا۔ اور خود رستہ پر آ کر دوڑنے لگا۔ اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ جب میری آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا۔ گھوڑا مجھے لے کر ڈاک بنگلہ پر پہنچ گیا ہے۔ جمعدار میرے پاس کھڑے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں۔ کوتوال صاحب ہم یہاں سے وہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جو آپ نے پاس سے دیکھا ہے۔ آپ نے غضب کیا کہ اس بلا کے سر پر پہنچ گئے۔ دیکھئے یہ چندن پور کا چوکیدار اس بلا کی نسبت کیا کہتا ہے۔ میں گھوڑے پر سے اتر کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر اب تک میرا سانس ٹھکانہ نہ ہوا تھا۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ چوکیدار نے ہاتھ باندھ کر کہا حضور یہ عورت ہمارے مرگھٹ کی دیوی ہے پچاس برس سے میں اسے گاہے گاہے دیکھتا ہوں اور سو برس سے ہمارے چندن پور میں مشہور ہے کہ یہ عورت مرگھٹ کی داروغہ ہے اور بارہا نظر آئی ہے۔ اور نظر آتی رہتی ہے۔ یہ خدا کو ہی معلوم ہے کہ یہ کوئی روح ہے یا جنبہ ہے۔ یا کوئی بلا ہے۔ چونکہ یہ بات عجیب و غریب تھی اس لئے میں نے قلم بند کر دیا۔ اور بذریعہ ڈاک اسے دلی بھیجدیا کہ میرے دوست میر قربان علی صاحب اسے اردوئے معلےٰ کا آویزۂ گوش کریں۔

لال قلعہ کی جھلک ظرافت آمیز

بہادر شاہ ابو ظفر کے عہد میں غدر سے پہلے دو داستان گو شہر میں مشہور تھے۔ بڑے عبداللہ خاں اور چھوٹے عبداللہ خاں۔ دونوں کے دونوں اپنے فن میں کامل تھے۔ بڑے عبداللہ خاں اکثر حضور والا کو داستان سناتے تھے۔ اور حضور والا پسند فرماتے تھے۔

میر کاظم علی دہلوی جو داستان گوئی میں فرد تھے۔ انہیں کے شاگرد تھے۔ اور میر باقر علی دہلوی انہیں اپنے ماموں میر کاظم علی صاحب کے داستان میں شاگرد بے نظیر تھے۔ جو حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔

رات کا وقت تھا۔ حضور والا چھپر کھٹ پر لیٹے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں صاحب چھپر کھٹ کے پاس بیٹھے تھے۔ عبداللہ خاں نے حسب دستور داستان شروع کرنے سے پہلے یہ لطیفہ بیان کیا کہ امر گڑھ کے قلعہ کے پاس چوک میں دو مسافروں بات چیت کر رہے تھے:-

"آپ کی وضع سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔"

"جی ہاں! میں لکھنؤ کا باشندہ ہوں۔ مگر آپ کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ دہلی والے ہیں۔"

"بیشک میں دہلی رہتا ہوں۔ لکھنوی صاحب! یہ تو فرمایئے، آپ

یہاں کیوں آئے ہیں۔ اور کیا کام کرتے ہیں؟"
لکھنوی :۔ میں امیروں کو میٹھی میٹھی باتیں سناتا ہوں۔ آپ کیا شغل رکھتے ہیں۔؟
دہلوی ۔ میں بات میں رفو کرتا ہوں۔
لکھنوی ۔ ہم تم اس راجہ کے دربار میں چلیں ۔ اور اپنا ہنر دکھائیں۔
دونوں کی سرِ شام راجہ تک پہنچ ہوگئی ۔ راجہ نے کہا "کچھ بیان کرو"
لکھنوی :۔ حضور یہ فدوی آج ہی آپ کے شہر میں داخل ہوا ہے شہر سے ملی ہوئی ندی جو بہتی ہے ۔ اس میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ اتفاقاً ایک بیل ندی میں اُترا ۔ اس کا پاؤں پانی میں پھسلا ۔ گرا اور گرتے ہی بھسم ہوگیا اور اس کا ریشہ ریشہ پانی میں بہہ گیا"
راجہ :۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔
دہلوی :۔ حضور ان کا کہنا سچ ہے۔ بیل کی پیٹھ پر سوکھا چونہ لدا ہوا تھا۔ بیل کے گرتے ہی چونہ بجھا ۔ اور بیل کو گلا کر اس کی بوٹی بوٹی ٹکم دی۔
راجہ اس حاضر جوابی سے بہت خوش ہوا ۔ اور دونوں کو پچاس روپیہ دے کر رخصت کیا۔ راجہ کے محل سے نکل کر لکھنو والے نے دہلی والے سے کہا :۔ "کل پھر ہم تم مل کر راجہ کے ہاں چلیں گے"
دہلی والے بولے :۔ "میں تمہاری باتوں میں رفو نہیں کرسکتا ۔ تم بے تکی باتیں بناتے ہو۔ کجا سوکھی ندی میں بیل کا گرنا اور کجا اس کا بھسم ہوجانا ۔ وہ تو مجھے سوجھ گئی اور بات میں رفو ہوگیا۔

:۰:(۲):۰:

حسن بانو ایسے گھر میں بیاہی آئیں۔ جس میں سوائے اُن کے دولھا، ولایت بیگ کے دوسرا نہ کوئی مرد تھا نہ کوئی عورت تھی۔ البتہ حسن بانو کے جہیز میں ایک لونڈی آئی تھی۔ جس کا نام کینگی تھا۔ جب ولایت بیگ نے پینس سے نکال کر دولھن کو محل میں مسند پر لاکر بٹھایا۔ تو کینگی لونڈی بولی "دولھن بڑی نازک مزاج ہیں۔ سچ مچ پھول سونگھ کر جیتی ہیں۔ بس ایک چڑیا کی جیب اور ایک مانڈہ کا پھپولا کھاتی ہیں۔ اس کا بندوبست روز کر دیا کیجئے۔ اور خدا رکھے آپ کو سب طرح کے کھانے پکا کر میں کھلایا کروں گی۔"

ولایت بیگ اس بات کو سُن کر حیران ہو گیا۔ اور اس نے کہا:۔ "مانڈہ کینگی تم پکایا کرنا۔ اور چڑیا کی جیب میں روزانہ کاٹ دیا کروں گا۔"

اس بات کو چھ مہینے ہوئے۔ میاں بیوی ہنسی خوشی رہنے سہنے لگے۔ ولایت بیگ نے اپنے یار دوستوں سے کہا۔ "میری بیوی ایسی کم خوراک ہے کہ رات دن میں ایک چڑیا کی جیب اور مانڈہ کا ایک پھپولا کھاتی ہے۔"

یاروں نے کہا:۔ "مرزا تمہاری جورو تمہیں احمق بناتی ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ اور وقت بے وقت چھپ کر اُس کے کھانے پینے کو جانچو۔"

مرزا کے دل کو یاروں کا کہنا لگ گیا۔ اور ایک دن اُس نے

حسن بانو سے کہا "آج رات کو میں گھر نہیں آؤں گا۔ دوستوں کے ساتھ جلسہ میں رہوں گا۔ تم شام ہوتے ہی گھر کا دروازہ بند کر لینا۔ اور تم دونوں ہوشیار رہنا۔"

یہ بہانہ کر کے وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ اور چھپ کر بیٹھ رہا۔ بیوی سمجھی میاں جلسہ میں گئے۔ مغرب سے پہلے دروازے کی کنڈی لگا لی۔ اور بیوی باندی کھا پی کر سائبان میں سو رہیں۔ ایک پہر کے بعد بیوی کی آنکھ کھلی اور وہ اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "کیتکی رات کتنی؟" کیتکی بولی۔ "بیوی پہلا پہرا"

بیوی نے کہا "مارے بھوک کے میرا دم نکلا جاتا ہے، تو کچھ پکا کر جلدی لا"

کیتکی نے کہا "ہر طرح کی جنس خدا رکھے گھر میں ہے۔ جو حکم ہو۔"

بیوی:- سیر بھر تل۔ سیر بھر قند۔ سیر بھر گھی، لیکر تل کٹ بنا لا۔

لونڈی تل کٹ بنا لائی۔ حسن بانو تل کٹ سب ڈکار گئی۔ اور بچھونے پر پڑ کر سو گئی۔ کچھ دیر بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کہا۔ "کیتکی رات کتنی؟" کیتکی نے کہا "دوجا پہرا"

حسن بانو نے کہا "اری کمبخت مارے بھوک کے میری جان ہوا ہوئی۔ کچھ پکا کر جلدی لا۔ دیکھ سیر بھر میدہ، سیر بھر کھانڈ، سیر بھر گھی کی ٹکیہ پکا لا"

لونڈی نے روغنی روٹ پکا کر حسن بانو کو کھلا دیا۔ اور وہ پھر سو گئی۔ اور کچھ دیر بعد پھر اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کہا۔ "کیتکی رات کتنی"؟ لونڈی نے کہا۔ "تیجا پہرا" حسن بانو بولی۔ اری مردار بھوک کے مارے میرا دم نکلا۔ کچھ پکا کر

فوراً لا۔" لونڈی نے کہا۔ "جو حکم ہو۔"
حسن بانو:۔ "دو سیر مونگ کی کھچڑی۔ سیر بھر گھی لے کر جھٹ پٹ پکا کر حاضر کر۔"
لونڈی کھچڑی پکا لائی۔ اور حسن بانو اُسے چاٹ کر پڑ گئی۔ اور خراٹے لینے لگی۔
پھر جو پکا یک اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے کہا۔ "کتنی رات گئی؟" لونڈی
نے کہا۔ "بیگم چوتھا پہرا۔"
حُسن بانو:۔ ہائے اللہ وہ بندی بھوکی مری۔ ارے نا نصیب بھوک نے میرا
کام تمام کیا۔ تو دو سیر رو ا۔ دو سیر کھانڈ۔ سیر بھر گھی لے کر پنجیری بنا۔ لا۔ اُسے
پھانک کر دو گھونٹ پانی پی کر اپنا دم تمام ہو لی گی۔"
پنجیری بن کر آئی۔ حسن بانو نے کھائی، پھر جو پڑ کر سوئی تو دن کے آٹھ
بجے اُٹھی۔ اور اس نے دیکھا میاں انگنائی میں ایک ہنڈیا لئے بیٹھے ہیں جس
کا منہ کپڑے سے بندھا ہے۔ بیوی اٹھکیلیاں کرتی میاں کے پاس آ کر کہنے
لگیں۔ "اجی صبح ہی صبح کیا لائے ہو؟"
میاں نے ہانڈی کا منہ کھولا۔ اور اس میں سے کالا سانپ پھنپھنا کر
کھڑا ہو گیا۔
بیوی:۔ (سانپ کو دیکھ کر) "وہی میاں یہ کالا۔"
میاں۔ "بیوی تل کٹ بھر اگنڈالا۔"
بیوی۔ "وہی میاں یہ ہونا۔"
میاں:۔ "بیوی بھول ہیں کا رونا۔"
بیوی: "وہی میاں یہ چلے۔"

میاں :- بیوی کچھڑی میں گھی جھلے۔
بیوی :- وہی میاں اسے ڈھانکو۔
میاں :- بیوی سارے گھر کا آٹا پھانکو۔

"بیوی تو کوئی بلانوش عورت ہے، منہ سوئی پیٹ کوئی۔ عورتوں کا قاعدہ ہے کہ مردوں کو طرح طرح سے ستاتی ہیں۔ مجھ سے کہا۔ میں چڑیا کی جیب اور ہانڈہ کا پھوپلا کھاتی ہوں۔ اور در پردہ ایک بیل کا ہاتپ زہر مار کرتی ہے لعنت ہے ایسے ہوگے پر۔"

:۰: (۳۴) :۰:

پودینہ نام شاہ عالم کے عہد میں ایک نقال تھا۔ بادشاہ اُسے مہربانی اور قدر کی آنکھ سے دیکھتے تھے۔ اکثر اوقات دربار میں حاضر رہتا تھا۔ یہاں تک عنایت تھی کہ بادشاہی جلوت اس کے واسطے خلوت کا حکم رکھتی تھی، ایک روز بادشاہ کو کسی تقریب سے اس نے ننگا دیکھ لیا تھا۔ اور یہ بات بادشاہ پر بھی ظاہر ہوگئی تھی۔ بادشاہ کو نہایت غصہ آیا۔ یہ بھی اس وقت حاضر تھا۔ اور سامنے سنتری پہرہ پر ٹہل رہا تھا۔ اُس سے کہا کہ اس نالائق کو حوالات میں رکھو" اس کو اس وقت تو کچھ بن نہ پڑی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات، ناچار سنتری کے ساتھ ہو لیا۔ اس سے پہلے کہ سنتری کچھ اس کی نسبت کہے، جھٹ بول اٹھا کہ" داروغہ صاحب اس سنتری سے کچھ خطا سرزد ہوئی ہے۔ حضور والا کا حکم ہے کہ یہ حوالات میں رکھا جائے" سنتری نے کہا" نہیں اس کے واسطے حوالات کا حکم ہے" اس نے کہا" لو اور سنو۔

دروغ گویم بر روئے تو۔ حکم سنتری کے واسطے ہوا۔ حوالات میں بھگتوں۔ داروغہ کو یقین تھا کہ یہ تو بادشاہ کی ناک کا بال ہو رہا ہے۔ اس کو بادشاہ حوالات کا حکم کیوں دیتے۔ بیشک اس سنتری کے واسطے حکم ہے۔ کچھ اس سے قصور ہوا ہوگا۔ پودینہ سنتری کو حوالات میں پھنسوا کر پھر بادشاہ کو آداب بجا لایا۔

بادشاہ نے کہا۔ "ناشدنی تو نے پھر اپنا روئے سیاہ دکھایا ہم نے تجھے حوالات کا حکم دیا تھا"۔ کہا "خداوند فدوی اس سنتری کو حوالات سپرد کر تو آیا"۔ بادشاہ نے اس کی بات پر مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ اور حکم دیا کہ "یہ نامعقول دربار میں حاضر نہ ہوا کرے"۔

کچھ دن اسی طرح گزرے۔ آخر ایک دن باغبان کو کچھ روپیہ دیئے کہ مجھ کو ٹوکرے میں بند کر کے دربار میں لے چل۔ باغبان حضور والا کے لئے کچھ گلدستہ بنا کر اور پودینہ کو ٹوکرہ میں بند کر کے دربار میں لے پہنچا۔ گلدستہ پیش کئے۔ بادشاہ نے پوچھا "اس ٹوکرہ میں کیا ہے"۔ آپ جلدی سے ٹوکرے میں سے بولے۔ "حضور وہی آپ کا پودینہ ہے"۔ بادشاہ ہنس دیئے۔ اور قصور معاف کر دیا۔

(۱۰)

جاننے والے جانتے ہیں کہ عرفی اکبر کے عہد میں ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ ایک روز اکبر فتح پور سیکری جا رہے تھے۔ عرفی اور فیضی بھی حاضر تھے۔ راستہ میں بادشاہ نے ایک ٹبیا دیکھی۔ دونوں طرف سبزہ اور بیچ میں ایک سیدھی لکیر۔ بادشاہ نے عرفی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ ٹبیا

اس وقت کیسی خوبصورت اور اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ادھر ادھر سبزہ بیچ میں ایک سیدھی اور سفید تحریر۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی معشوق کے سر کی مانگ ہے۔ یا آسمان نیلی فام پر کہکشاں ہے"۔ عرفی نے جو بادشاہ کا میل اس طرف دیکھا تو فوراً فی البدیہہ ایک شعر اس مضمون پر کہہ کر بادشاہ کو سنایا۔

این سطرے جادہا کہ بصحرا نوشتہ اند ؎

احوال رفتہ الیست کہ از پا نوشتہ اند

بادشاہ نے نہایت تعریف کی۔ دو تین روز کے بعد فیضی اور بادشاہ دونوں بجرہ میں بیٹھ کر دریا کی سیر کر رہے تھے۔ اکبر نے فیضی سے کہا:۔ "اس روز عرفی کا شعر سنا"۔ فیضی نے کہا "غلام نے سنا تھا"۔ اکبر نے کہا "اس موقع کے لحاظ سے تم بھی کچھ کہو"۔ فیضی نے دریا کی روانی دیکھ کر کہا ؎

این سطر موجہا کہ بدریا نوشتہ اند

احوال گریہ الیست کہ ازما نوشتہ اند

اکبر پھڑک اٹھے اور کہا "بھئی تم نے نرالی بات پیدا کی ہے۔ مگر انصاف شرط ہے کہ پہلا شعر عرفی کا ہی ہے"۔ فیضی نے کہا "اس میں کیا شک ہے"۔

:۰:(۵):۰:

عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں ایک شخص فولاد خاں نامی شیدی دلّی میں کوتوال تھا۔ ایک روز بازار میں پالکی پر سوار چلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ادھر

ایک آزاد فقیر چلا آتا تھا۔ فولاد خاں کو دیکھ کر موقع سے ایک طرف کھڑا ہو گیا جب فولاد خاں کی پالکی آزاد کے پاس آئی تو کہنے لگا " اوبے انگیٹھی کے کوئلہ کچھ ہمیں بھی "

اس واہیات بات کو سنکر فولاد خاں آگ بگولا ہو گیا۔ اور اپنے نوکر کی طرف اشارہ کیا کہ اس بدمعاش کو دھکے دو۔ نوکروں نے دھکے دینے شروع کئے۔ آزاد کہنے لگا " بابا جھنو نہیں، جھنو نہیں " یہ بات فولاد خاں کو پسند آئی۔ اور آزاد کو انعام دیا، آزاد نے انعام لے کر دعا دی کہ بابا لال رہو۔ (یعنی کوئلہ کی مناسبت سے یہ باتیں کہیں)

(۶)

عالمگیر بادشاہ حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز نعمت خاں عالی سے فرمایا کہ۔ " کیوں نعمت خاں پہلے حیدرآباد کا کیا نام تھا " عرض کیا۔ " فرخندہ بنیاد حیدرآباد "

بادشاہ نے فرمایا " اور اب دار الجہاد حیدرآباد " نعمت خاں نے کہا کیا شک ہے۔ حضور معلی نے دین کو از سر نو زندہ کیا ہے کوئی سنت وفرض ایسا نہ ہوگا۔ جو حضور نے ادا نہ کیا ہوگا۔ مگر ایک سنت بندگان عالی سے ادا نہ ہوئی۔ اگر وہ بھی ادا ہو جائے تو کوئی سنت باقی نہ رہے عالمگیر نے پوچھا وہ کیا سنت باقی ہے۔ کہا سرور کائنات نے گدھے کو بھی اپنی سواری سے شرف بخشا ہے۔

عالمگیر نے کہا بیشک یہ سنت رہی جاتی ہے۔ اچھا کل ہم گدھے پر

سوار ہوں گے۔ اراکین سلطنت نے جو یہ بات سنی تو ہوش اڑ گئے۔ آپس میں کہنے لگے اگر بادشاہ حیدرآباد میں گدھے پر سوار ہو کر نکلے تو بڑا غضب ہوگا۔ نعمت خانِ عالی کو خدا غارت کرے۔ یہ افترا پردازیاں اسی فیلسوف کی ہیں اب اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی چل کر خوشامد کرو ورنہ یقین ہے کل بادشاہ گدھے پر ضرور سوار ہونگے۔ چنانچہ سب مل جل کر نعمت خاں عالی کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے۔ بھئی خدا کے واسطے یہ کیا آگ لگائی ہے۔ بادشاہ کی دور دور بدنامی ہوگی۔ اور تمہارا کچھ نہ جائے گا۔

نعمت خاں نے کہا۔ خالی خوشامد سے کام نہیں چلتا۔ کچھ دلواؤ۔ تو بادشاہ کو گدھے کی سواری سے روکوں۔ سب امرا نے کہا۔ جو تم کہو۔ نعمت خاں نے کہا کہ ایک ایک مہینہ کی تنخواہ سب میرے حوالہ کیجئے۔ سب نے وعدہ کیا کہ ہم ایک مہینہ کی تنخواہ تم کو دیدیں گے۔ نعمت خاں نے کہا تو میں بادشاہ کو کبھی گدھے پر نہیں چڑھنے دوں گا۔ دوسرے دن بادشاہ کے لئے ایک گدھا زین سے سجا کر لایا گیا۔ نعمت خاں وقت پہنچ گئے تھے۔ اور بادشاہ سے کہا ظلِ سبحانی نے تمام سنتیں ادا کر دی ہیں۔ پر میری رائے ناقص میں اس سنت سے باز رہیں۔ کیونکہ حضور تمام سنتیں ادا کر چکے ہیں۔ صرف ایک یہ سنت (یعنی گدھے پر چڑھنا) باقی ہے اگر حضور نے یہ سنت بھی ادا کر دی تو حضور سرورِ عالم سے مساوات اور برابری ہو جائیگی اور یہ خلاف ادب ہے۔ بادشاہ نے یہ بات تسلیم کری اور گدھا واپس کر دیا گیا اور نعمت خاں نے تمام امراء سے ایک ماہ کی تنخواہ وصول کر لی۔

پانچ ہزار طنبورے اور ستار کا نذرانہ

ابرو نے کیوں کھینچی کماں یہ لف کیوں پیچیدہ ہے
بھرتا ہوں تیری مانگ میں یہ صندل سائیدہ ہے

سنا جاتا ہے کہ دلی کے عیش پرست بادشاہ ہاتھی پر سوار لال قلعہ سے شہر میں گزر رہے تھے۔ حضور والا کی سواری کے چاروں طرف سوار اور پیادوں کا ہجوم تھا۔ سرِراہ ایک کوٹھا تھا جس کی چار دیواری نیچی اور بادشاہ کی سواری اونچی تھی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ایک کمسن عورت اپنے صحن میں ایک پلنگڑی پر بیٹھی کنگھی کر رہی ہے۔ سامنے آئینہ رکھا ہے۔ بار بار آئینہ میں اپنا منہ دیکھتی ہے۔ اور اپنی مانگ سنوارتی ہے۔ عورت قمر دیدار اور گل رخسار تھی۔ دیکھتے ہی حضور والا کا دل اُس پر آگیا۔ جب حضور والا سیر سے پلٹ کر لال قلعہ میں آئے تو وزیر کے کان میں چپکے سے فرمایا۔ میں نے اس طرح اس محلہ اس کوٹھے پر ایک پریزاد سرو آزاد دیکھا ہے۔ اُسے کسی طرح بلواؤ۔

وزیر نے کہا۔ بہت خوب۔ یہ کہہ کر وزارت پناہ اس کام کے سرانجام کے لئے حضور والا سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ اور خفیہ قاصد اس کی ٹوہ میں لگائے۔ معلوم ہوا کہ ارباب نشاط کے گھرانہ کی

اٹھتی کونپل ہے۔

وزیر نے اُس کے وارثوں کو بُلا کر اُن سے کہا "تمہارے نصیب جاگ اُٹھے۔ فلاں مسماۃ حضور والا کو پسند آگئی ہے۔ میں پنس تمہارے ساتھ کئے دیتا ہوں۔ اُسے فوراً اس میں بٹھادو۔ اور بادشاہی حرم سرا میں پہنچادو"

وارث بولے، اللہ کی امان۔ پیروں کی پناہ۔ دم قدم کی خیر ہماری تو جان بادشاہ کے اوپر سے قربان ہے۔ وہ لونڈی کیا چیز ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر کبتو محلسرا میں پہنچ گئیں۔ حضور والا نے جو کبتو کو پاس سے دیکھا تو بیچ بیچ اس کے جوبن پر لٹو ہو گئے۔ دل فریب محل اُسے خطاب عطا فرمایا۔ اب کیا تھا۔ دل فریب محل کی چڑھ بنی۔ اُس نے سال بھر میں کئی ہزار اپنے عزیزوں کو بڑے بڑے عہدوں پر پہنچادیا۔ تال سم کی جاننے والی قوم مسند اور قالین سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اور شریف عہدوں سے اُتر کر روٹیوں سے محتاج ہو گئے وزیر صاحب کی کمان بھی اُتر گئی۔ اور وہ سہم کر چلّا اٹھے۔

دلفریب محل کے چچا دکن گئے ہوئے تھے۔ جب انہیں خبر پہنچی کہ بھتیجی بادشاہ کے گھر میں ہے۔ اور بادشاہ اس کے پھندے میں پھنس گئے ہیں۔ تو وہ اپنا سرود لے کر اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ تو دلی آکر دم لیا۔ بھتیجی سے ملے۔ بھتیجی بھی چچا کو دیکھ اس قدر شاد ہوئی کہ تالیاں پیٹنے لگی۔ جب علی بخش سرودیئے کو یقین ہوگیا کہ بادشاہ بھتیجی کی مٹھی میں ہے۔ بھتیجی سے کہا میں ایسا ویسا قلیل عہدہ تو چاہتا نہیں۔ اگر تو بڑے

جب رات کو حضور والا دلفریب محل کے پاس حرم سرا میں رونق افروز ہوئے تو دلفریب محل نے کہا۔ کہ میرے چچا بڑے لائق فائق شخص ہیں کوئی بڑا عہدہ انہیں دیجئے۔ اور اُن کی لیاقت کے جوہر دیکھئے۔ بادشاہ نے فرمایا کیوں نہیں۔ کل صبح میں وزیر سے پوچھوں گا۔ اور جیسا منہ ویسی پھٹیر انہیں اُن کے رتبہ کے موافق عہدہ ملے گا۔ دوسرے دن دربار میں حضور والا نے وزیر سے پوچھا۔ کوئی عہدہ خالی ہے ؟

وزارت پناہ نے ہاتھ باندھ کر کہا حضور! سرحدی افغانوں کی سرکوبی کے لئے ایک لشکر جانے کیلئے تیار ہے۔ اُس کی سپہ سالاری کے لئے فدوی خود عرض کرنی چاہتا تھا۔ کہ کسے نامزد کیا جائے ؟

حضور والا:- بس ہم نے دلفریب محل کے چچا کو یہ عہدہ دیا۔ اُنہیں سپہ سالار بنا کر آج ہی معہ فوج کے سرحد پر روانہ کر دو۔ سر دوبہ صاحب خضاب لگا دربار میں حاضر ہوئے۔ آداب بجا لائے۔ اور خلعت سپہ سالاری پہن شمشیر مرصع حضور کے دست مبارک سے لیکر دربار سے نکلے اور یلغار کرتے ہوئے سرحد پر پہنچ گئے۔ بادشاہی فوج سے افغانوں کا مقابلہ ہوا۔ افغان اپنے چھرے اور لٹھ لے کر بادشاہی فوج پر پل پڑے۔ میاں علی بخش نے دیکھا کہ اُن کی سپاہ گاجر مولی کی طرح کٹ رہی ہے۔ اور خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اس عالم کو دیکھ کر یہ تو تانت کی طرح سوکھ گئے۔ آنکھوں کے سامنے بھیر دل ناچنے لگا۔ کسی کے پاؤں کا لنگڑاپن اور کسی نے کسی کی کلائی توڑی دیکھ کر ٹوڑی کی سرگم بھول گئے۔ ڈر کے مارے خان صاحب کا پیجامہ نجس ہو گیا اور

گنگنا کر کہنے لگے ؎

تن تنی بجاتے، میاں کھاتے شکر گھی
ایسی نوکری کی ایسی تیسی اب کے بچے جی

بادشاہی اقبال یاور تھا۔ افغان گٹا چھنی کر کے چل دیئے۔ پالا انہیں کے ہاتھ رہا۔ ٹھاٹھ بدل کر دلی پہنچے۔ بھتیجی سے کہا وزیر کمبخت نے میری جان ہی لی تھی۔ مولا مشکل کشا نے بچالیا۔ مجھے تو کسی ملک کی صوبہ داری دلوا دے "تاکہ مسند پر بیٹھا سرگم الاپا کروں۔ دلفریب محل نے بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ سلامت نے وزیر سے استفسار فرمایا۔ کہ کوئی صوبہ داری خالی ہے؟ وزیر نے کہا ایک مہینہ سے لاہور کی صوبہ داری خالی ہے۔ نائب کام کر رہا ہے۔

حضور والا نے فرمایا۔ دلفریب محل کے چچا کو یہ خدمت دی جائے۔

وزیر نے کہا۔ بہت خوب"

دوسرے دن وزیر نے علی بخش سرودیہ کو ایوان وزارت میں بلا کر کہا۔ صوبہ داری لاہور کی آپ کو مبارک ہو۔ مگر یہ عہدہ منصبی کہلاتا ہے۔ جب یہ دیا جاتا ہے۔ تو اس کا نذرانہ جہاں پناہ ظل اللہ کی سرکار میں داخل کیا جاتا ہے۔

سرودیہ:۔ جو آپ ارشاد کریں وہ نذر میں پیش کروں؟

وزارت پناہ:۔ کچھ نہیں! آپ پانچ ہزار طنبورے اور ستارے سرکار میں پہنچا دیجئے۔ اور صوبہ داری کا فرمان حاصل کر کے لاہور کا رستہ لیجئے۔

علی بخش:۔ حضور بہت خوب! کچھ مہلت۔

وزیر نے کہا۔ ایک مہینہ کی مہلت ہے۔

علی بخش دوڑے دوڑے اپنی بھتیجی کے پاس آئے۔ اور سارا حال کہا۔
بھتیجی نے کہا۔ یہ ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ روپیہ جس قدر چاہئے مجھ سے لیجئے اور
اور ساز مول لے کر داخل کر دیجئے۔ علی بخش روپیہ لے کر بازار میں گئے اور ساز
ڈھونڈنے لگے۔ بڑی تلاش اور جستجو سے کوئی دو سو ڈھائی سو ستار طنبورے
ملے۔ بنانے والوں نے کہا۔ پانچ ہزار سازوں کا بنانا اور ان کی جواری کھولنی
ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اور وہ بھی بادشاہ کی سرکار کے لئے۔ کم از کم ایک سال میں
ہم بنا پائیں گے۔ آپ پیشگی روپیہ دیدیجئے۔ تاکہ سامان بہم پہنچائیں۔
علی بخش نے جا کر دلفریب سے کہا۔ کاریگر یہ کہتے ہیں ؎
در سال اگر مے کہ خورد زندہ کہ ماند
دلفریب نے کہا۔ میں جانتی ہوں، یہ وزیر نے جو آڑ کواڑ کی لی ہے
یہ اس کی حرمزدگی ہے۔ تم ٹھہرو میں اُسے دھنیے کی کھوپڑی میں پانی پلواؤنگی۔
علی بخش خان اپنے گھر گئے۔ اور دلفریب بانو انٹوا ٹی کھٹوا ٹی لے
پڑرہیں۔ بادشاہ آئے تو دیکھا۔ بیگم منہ اوندھائے چھپر کھٹ میں پڑی سسکیاں
لے رہی ہیں۔ بادشاہ نے گھبرا کر کہا۔ خیر ہے۔ مزاج کا کیا حال ہے؟ دلفریب
نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور کروٹ لے لی۔ بادشاہ نے بلک کر کہا۔ خدا کو مان کر
کہو تو سہی کیا ماجرا ہے؟

دلفریب محل:۔ وہ موا مونڈی کاٹا وزیر بے سُری الاپتا ہے۔ اور یہ کہتا
ہے کہ یہ منصبی عہدہ ہے۔ خاں صاحب جب تک آپ پانچ ہزار طنبورے
اور ستار سرکار شاہی میں نہ پہنچائیں گے۔ صوبہ داری پر لاہور نہیں جا سکتے۔

اچھی خدا کے لئے کیا قانون ہے۔

بادشاہ:۔ بیگم تم اپنا دل میلا نہ کرو۔ میں نا شدنی وزیر کو بلا کر ابھی سزا دیتا ہوں۔ اور چچا آبا کو لاہور بھیجتا ہوں۔ بادشاہ غصہ سے کانپتے ہوئے باہر تشریف لائے وزیر کو بلایا۔ اور فرمایا۔ یہ تم نے بیچارہ علی بخش کے ساتھ کیا کھڑاک لگا یا ہے اور یہ پانچ ہزار ستار اور طنبورے اس مرد آدمی سے کیوں طلب کئے گئے ہیں۔ سرکار شاہی میں ان کمبخت چیزوں کی کیا ضرورت پیش آئی۔

وزیر:۔ جہاں پناہ! دلفریب محل کے سینکڑوں اور ہزاروں عزیز اُن کی سفارش سے بادشاہ کے ہاں عہدے پا رہے ہیں۔ اور شریف لوگ نکالے جا رہے ہیں۔ اس لئے فدوی نے اب یہی مناسب سمجھا ہے کہ جس شریف کو عہدہ سے برطرف کروں۔ اور دلفریب محل کے بھائی بندوں کو وہاں رکھوں۔ تو اس عہدہ دار کو سمجھا دوں کہ اب تمہاری اس سرکار میں سمائی نہیں ہے۔ ازراہ تراحم بادشاہ کی طرف سے یہ طنبورہ یا ستارہ تمہیں دیا جاتا ہے۔ یہ ہاتھ میں لو۔ گاتے بجاتے روٹی کماتے پھرو۔ اور اپنی زندگی پوری کرو۔

بادشاہ سلامت:۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ ان چیزوں کی فرمائش خصوصاً علی بخش سے کی گئی ہے۔

وزیر:۔ جناب والا! علی بخش خاں اسی پیشہ کے آدمی ہیں۔ پڑھے نہ لکھے ساری عمر ان کی سرود بجاتے گزری۔ اس لئے انہیں کے خاندانی پیشے کے لحاظ سے نذرانہ مانگا گیا ہے۔

بادشاہ سلامت:۔ ہیں! کیا علی بخش ڈھاری ہے؟

وزیر :- جی ہاں! حضور اقدس۔
بادشاہ سلامت :- کیا اس کی بھتیجی بھی گائن ہے؟
وزیر :- بیشک ایک چنے کی دو دالیں۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ وہ مرد ہے۔ اور یہ عورت ہے۔
حضور والا - لَاحَولَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ ۔ ارباب نشاط نے جس دربار میں رسوخ پایا - اور وہ دربار تار یجے تار ہوا - یہ مثل سچ ہو گئی

منہ لگائی ڈومنی اور کنبہ لائی سات

بزرگوں نے سچ کہا ہے ؎

ما لشے باسیت ارا تا کہ بر لبط راہی
گو شمالی شرط باشد تا در آید در نوا

ابھی اس بلائے بد کو محل سے نکالو۔ اور اس کے سارے خاندان کو ہماری سرکار سے دور کرو۔ توبہ۔ توبہ!! فقط

اے بڑھیا میں کیا؟

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست
زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

آغا قیس (اپنی بیوی الماس خانم سے) بیگم! دیکھو۔ میں دلّی چھوڑ کر کلکتہ جا رہا ہوں۔ آنے جانے میں برسوں لگیں گے، اور زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ خدا جانے تم لوگوں کی شکل پھر دیکھنی نصیب ہو یا نہیں۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ تم میری پیٹھ پیچھے میری اماں جان سے نہ لڑنا۔ اور نہ انہیں ستانا اور کپڑے لتّے یا کھانے پینے کی تکلیف نہ دینا۔ نہیں یاد رکھنا قیامت کے دن تمہارا دامن ہوگا۔ اور میرا ہاتھ ہوگا۔ اتنا کہہ کر قیس چپ ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

الماس خانم۔ بھلا چلتے وقت تم کیوں بدشگونی کرتے ہو۔ خواہ مخواہ رونے بیٹھ گئے۔ تم خوشی خوشی سدھارو۔ میں تمہاری اماجان کو آدھی بات بھی نہ کہوں گی۔ اور ان سے بھول کر بھی نہ لڑوں گی۔ جس وقت سے تم نے مجھے محشر میں دامنگیر ہونے کی دھمکی دی ہے۔ اپنے دیدے گھٹنوں کی قسم ڈر کے مارے میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ توبہ۔ توبہ۔ الٰہی توبہ! ساس میں اور سگی ماں میں فرق ہی کیا ہوتا ہے۔ میں تو ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔

بیوی کی باتوں سے آغا قیس کو تسکین ہو گئی۔ اور وہ بیچارہ کلکتہ روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد آٹھ دن تک بہو نے ساس سے کچھ چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ مگر نویں دن الماس خانم کی والدہ شریفہ بی یاقوت بیگم آن براجیں۔ اور آتے ہی انہوں نے بیٹی کو بہکایا۔ باؤلے کو آگ دکھائی۔ اُسنے گھر کو لے لگتی آگ لگائی۔ اور وہ چڑیل کی طرح ہاتھ دھو کر بی عزت نساء کے پیچھے پڑی۔ (عزت لنساء آغا قیس کی ماں کا نام ہے)

عزت نساء۔ بادشاہ زمانی (بہو کا خطاب ہے) کل جمعہ کے دن سر دھولوں تو اچھا ہے۔ کیونکہ میرے بال چکٹ گئے ہیں۔ آج آنولے منگا دو۔ رات کو بھگو دوں گی تو صبح تک خوب گل جائیں گے۔

الماس خانم۔ بوڑھا چونچلا جنازے کے ساتھ۔ قبر میں تو پاؤں لٹکائے بیٹھی ہو۔ اور اپنے تئیں سمجھتی ہو بارہ برس کی لڑکی۔ آنولے تو جوان عورتیں سر میں ڈالا کرتی ہیں۔ جو اپنے بالوں کو سیاہ بھونرا بنانا چاہتی ہیں۔ خاک پڑے اس ہوس کاری پر۔ کالا منہ، نیلے ہاتھ پاؤں۔ خدا کی لعنت، خدا کی پھٹکار، شیطان کا دھکا۔ میں نے تیرے بیٹے کو عمل پڑھ پڑھ کر دلی سے اسی لئے نکالا ہے۔ کہ تجھ سے عمر بھر کے بدلے لیلوں۔ اور تیری فریاد کو پہنچنے والا چڑیا کا بچہ تک نہ ہو۔ خدا نے اور اس کے حبیب نے چاہا تو تیرے تکلے کے سے بل نکالوں گی۔ موئی پدم شکری۔ چوٹی چمپا۔

بی عزت نساء خون کے سے گھونٹ پی کر چپ ہو گئیں۔ اور بہو کی باتوں کا اصلا جواب نہ دیا۔ یاقوت خانم کو سمدھن سے بڑی لاگ تھی۔ بیٹی کے اس

بُرا بھلا کہنے پر بھی ان کے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑی۔ اور انہوں نے الماس خانم کے کان میں کہا " اگر تو گھر میں چین سے رہنا چاہتی ہے۔ تو اُس بڑھیا مردار کو مار پیٹ کر گھر سے نکال باہر کر"

الماس خانم ماں کے اس بہکائے سکھائے میں بھی آگئی۔ اور اس نے ایک دن مغرب کے وقت بی عزت نساء کو اس بے دردی سے مارا کہ وہ بدنصیب سسکنے لگیں۔ اور باندیوں کی مار سے لہولہان ہوگئیں۔ انہیں غش آگیا۔ اور رات کے آٹھ بجے تک وہ مردہ کی طرح پڑی رہیں۔

یاقوت خانم نے الماس خانم سے کہا کہ بیٹی تیرا گھر شہر کے کنارے پر بنا ہوا ہے۔ اور جنگل پاس ہے۔ اپنی ساس کو گٹھڑی میں باندھ کر جنگل میں پھینک آ۔ رات بھر میں گیدڑ، بھیڑیئے لاش کو کھا پی کر برابر کر دیں گے۔ جب تیرا خاوند دو چار برس میں آئے گا تو کہہ دیں گے۔ تمہاری اماں مر گئیں اور فلاں قبرستان میں رکھی گئیں۔ برسات میں قبر ان کی دہ گئی۔ اور نشان بھی نہیں رہا۔ صبر کرو۔ الماس خانم نے اپنی ماں کا یہ کہنا بھی قبول کیا۔ اور بی عزت نساء کو کپڑے میں باندھ کر جنگل میں ڈال آئی۔ مگر جس کپڑے میں باندھ کر لے گئی تھی وہ لے آئی۔ تاکہ اس کے حوالے سے پکڑا پکڑی نہ ہو۔ اس رات کو دونو ماں بیٹیاں پاؤں پھیلا کر چین سے سوئیں۔

رات کے بارہ بجے کچھ ٹھنڈک ہوئی تو بی عزت کو ہوش ہوا۔ اور چوٹوں کی تکلیف سے وہ زمین پر پڑے پڑے کراہنے لگیں۔ کیونکہ کلونتی بہو نے چار چوٹ کی مار انہیں دی تھی۔ ناگہاں انہوں نے دیکھا کہ تین شخص سفید پوش مشرق

کی طرف سے آگے پیچھے چلے آتے ہیں؟ چلتے چلتے وہ اتفاقاً عزت نساء کے پاس پہنچ گئے اور بڑی بی کو پڑا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ اور کہنے لگے ہم آپس میں اپنا فیصلہ قیامت تک نہ کر سکیں گے۔ دیکھو یہی آدم اور اشرف المخلوقات ہے۔ اس بڑھیا سے پوچھو۔ اور جو یہ حکم لگائے۔ اسے تسلیم کر لو۔ تینوں شخصوں نے کہا۔ بیشک انسان کا بڑا رتبہ ہے۔ اور یہ اللہ کا خلیفہ ہے۔ ہمارے حق میں جو کچھ اس کے منہ سے نکلے اس پر ہم سب کو یقین لانا چاہئے۔ اچھا پہلے میں ہی اپنی نسبت اس سے پوچھتا ہوں۔ اتنا کہہ کر ان تین سفید پوشوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ اور اس نے بی عزت سے کہا "اے بڑھیا میں کیسا ہوں؟

عزت نساء:- (کراہ کر) بیٹا مجھے کیا معلوم ہے۔ تم کون صاحب ہو۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو میں کہوں تم ایسے ہو۔

سائل۔ میں ہوں جاڑے کا موسم اب بتاؤ میں کیسا ہوں؟

عزت نساء۔ سبحان اللہ جاڑے کے کیا کہنے ہیں۔ کنوار لگتے ہی لحاف توشکیں تیار ہونے لگتی ہیں۔ رضائیاں۔ کمریاں۔ قبائیں چھینٹ کی مخمل کی بنائی جاتی ہیں۔ گرمی کے موسم کے پیاسے ٹھنڈا پانی پی پی کر اپنا کلیجہ خنک کرتے ہیں جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ اس لئے کھانا خوب ہاضم ہوتا ہے۔ بھوک بھی بیتابی سے لگتی ہے۔ گرم گرم چائے پیتے ہیں۔ حلوا سوہن۔ گاجر کا ٹھیا۔ اسی موسم کا تحفہ ہے۔ بادام۔ پستہ۔ چلغوزہ۔ اخروٹ انہی دنوں میں کھاتے ہیں۔ مسجدیں نمازیوں کے لئے سقاووں کے اندر پانی گرم کیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ نہائیں دھوئیں۔ وضو کریں۔ اور مسجد کے متولی کو ثواب حاصل ہو۔ عابد۔ زاہد جاڑے کی لمبی لمبی

راتوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ذکر و شغل دل کھول کر ہو سکتا ہے۔ سردی کے آتے ہی چق پردے کمروں دالانوں کے دروں پر باندھ دیئے جاتے ہیں کمروں کے اندر آتشدان اور انگیٹھیاں روشن کرتے ہیں۔ چھوٹے بڑے مل کر آگ تاپتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ کابلی۔ کشمیری سوداگروں کو ہزاروں کا فائدہ پہنچتا ہے۔ شال، دوشالہ۔ دُھسّے۔ پٹّو۔ بانات اور طرح طرح کے اونی کپڑے بکتے ہیں۔ گیہوں۔ جَو۔ چنا جاڑے ہی کے موسم میں بڑھتا پلتا ہے۔ صبح سے شام تک جاڑے کی دھوپ اچھی لگتی ہے۔ بیٹا گیا گھول، بہو نے مار کر اس بندی کا بھرکس نکال دیا ہے۔ کمزوری کے مارے بولا نہیں جاتا نہیں تیری سچی سچی تعریف میں اور بھی بیان کرتی۔

جاڑا۔ نہیں بڑھیا۔ تو نے اب بھی میری بہت کچھ تعریف بیان کی ہے۔ میں تیری باتیں سُنکر بہت خوش ہوا۔ لو یہ ہزار روپیہ کا ایک توڑا ہے۔ اسے تم اپنے علاج میں صرف کرنا۔ اور خدا تمہاری اس بے ادب بہو سے سمجھے جس نے ناحق تمہیں ستایا۔

یہ کہہ کر جاڑے نے ایک ہزار روپے کی تھیلی بی عزّت النساء کے پہلو میں رکھ دی اور خود پیچھے سرک گیا۔ اور اس کا دوسرا رفیق آگے بڑھا اور اس نے کہا۔ اے بڑھیا میں کیسا؟

عزّت نسا۔ میاں مجھے کیا خبر تم کون صاحب ہو؟ اپنا کچھ اتہ پتہ بتاؤ تو میں کہوں تم ایسے ہو۔

گرمی کا موسم۔ میں ہوں گرمی کی رُت۔

عزّت نساء۔ ماشاء اللہ چشم بد دور! گرمی کی رُت کی کیا تعریف ہوسکتی ہے گرمی کچے اناجوں اور کچے میووں کو پکاتی ہے۔ گرمی جب تک جاندار کے جسم میں باقی ہے۔ زندہ ہے۔ نہیں مردہ ہے۔ گرمی کے موسم میں ملائی کی برف۔ شربت کی برف قسم قسم کے شربت۔ تخم ریحاں۔ فالودہ۔ پن بھتا۔ کیسا بھلا لگتا ہے۔ شورہ میں پانی کی صراحیاں لگائی جاتی ہیں۔ لال لال صافیاں لپیٹی جاتی ہیں۔ کورے کورے مٹکے ٹھلیاں۔ جھجریاں۔ بھبکے کاغذی آبخورے پانی سے بھر کر رکھے جاتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ چھڑکاؤ کئے جاتے ہیں۔ امیر لوگ خس خانوں میں بیٹھتے ہیں خس کی ٹٹیاں لگاتے ہیں۔ ان پر پانی چھڑکتے ہیں۔ فراشی پنکھے کھینچے جاتے ہیں۔ تہہ خانوں کی قدر ہوتی ہے۔ کھیرے۔ گگڑیاں۔ تربوز۔ گرمی کے موسم کی نایاب چیزیں ہیں۔ آب رواں کے دوپٹے۔ باریک لیٹ کی محرم کرتیاں موتیا، جوہی کے گنٹھے۔ پھولوں کے گہنے کی بہار اسی موسم میں آتی ہے۔ واہ گرمی کی رُت! تیرے کیا کہنے ہیں۔ ایک لنگوٹی میں بھی آدمی بسر کرسکتا ہے۔ یہ کہہ کر عزت نساء چپ ہوگئیں۔ اور گرمی کو اپنی یہ صفت و ثنا بہت پسند آئی۔ اس نے بھی ایک ہزار روپے کی تھیلی بی عزت نساء کے پاس رکھدی۔ اور وہ پیچھے ہٹی۔ اب تیسرا رفیق بی عزت نساء کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا "اے بڑھیا میں کیسا ہے؟"

عزّت:۔ آپ یہ سمجھئے کہ ہیں کون؟ پھر میں آپ کو جواب دوں کہ آپ کیسے ہیں۔

برسات کا موسم :- میرا نام ہے برسات کا موسم۔ اب کہو میں کیسا ہوں۔
عزت نساء۔ واہ واہ! برسات کے کیا کہنے ہیں۔ برسات نہ ہو تو دنیا خاک میں مل جائے۔ جانداروں کا تو کیا ذکر ہے۔ جڑی بوٹیاں تک برسات کی آرزو رکھتی ہیں۔ برکھا رُت میں دھان پان، آم خصوصیت سے پیدا ہوتا ہے۔ باغوں میں جھولے پڑتے ہیں۔ ملہار گائے جاتے ہیں۔ کڑاہیاں چڑھتی ہیں رُم جھم، رُم جھم مینہ برستا ہے۔ جس کے دیکھنے سے دل کو تفریح ہوتی ہے۔ دلّی میں پھول والوں کی سیر کی دھوم ہوتی ہے۔ قطب صاحب کے مزار اور جوگ مایا جی کے مندر پر بیش قیمت پنکھے چڑھائے جاتے ہیں۔ پکوان تلے جاتے ہیں۔ اندرسے کی گولیاں۔ اندرسے۔ سہال پھینیاں برسات کے پانی سے ہی تیار ہوتی ہیں۔ کویل کوکتی ہے۔ پپیہے خوش آوازی سے بولتے ہیں مور جھنکارتے ہیں۔ جوار، باجرا۔ مونگ، ماش۔ مکئی اسی موسم کی پیداوار ہیں۔ جنہیں سال بھر کھا کر انسان و حیوان جیتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے ساگ اور سینکڑوں قسم کی گھانس برسات میں پیدا ہوتی ہے جس کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ اگر برسات نہیں ہوتی تو کال پڑ جاتا ہے۔ آدمی کو آدمی کھاتا ہے۔

برسات کا موسم بڑی بی کی زبان سے اپنی اس قدر تعریف سنکر شاد ہو گیا۔ اور اس نے بھی اپنی بغل سے ایک ہزار روپے کی تھیلی نکال کر بی عزت نساء کے پاس رکھدی اور پھر تینوں موسم بڑی بی کو سلام کر کے چل دیئے۔

بی عزت نساء روپیوں کا نام سنکر اپنی چڑوں کو بھول گئیں اور انہوں نے اٹھ کر تھیلیوں کو ٹٹولا۔ اور روپیوں کو ہاتھ لگنے سے ہی ان کا سارا ضعف و بلہ

ہو گیا۔ دو بجے رات کے بعد الماس خانم کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنی ماں یاقوت خانم کو جگا کر کہا۔ اماں تم نے مجھے بہت بُری مت دی کہ میں نے اپنی ساس کو مارا اور انہیں جنگل میں جا ڈالا۔ جب صبح کے وقت پڑوسی پوچھیں گے کہ اُن کی اماں کہاں گئیں؟ تو میں کیا جواب دونگی؟ اور اگر وہ کسی آدمی نے مری مل گئیں، یا ان کی ہڈیاں پائی گئیں، تو کوتوالی کا چبوترہ ہوگا۔ اور میری ہڈیاں کَسی جائیں گی۔ ابھی رات پردہ پوش موجود ہے۔ مناسب ہے کہ انہیں زندہ یا مردہ کو گھر میں لے آئیں۔

یہ کہہ کر الماس خانم اپنے بچھونے سے گھبرا کر اٹھی۔ اور پچھواڑے جنگل میں پہنچی، دیکھا تو بڑی بی کھونٹا سی بیٹھی ہیں۔ اور کوئی چیز ان کے پاس رکھی ہے الماس خانم نے چپکے چپکے اُن سے معذرت کی، اور کہا خدا کے واسطے گھر چلیے اور یہ آپ کے پاس کیا رکھا ہے؟ بی عزت نساء نے بہو کے کان میں تینوں موسلوں کے آنے اور تین ہزار روپے دیئے جانے کا حال بیان کیا۔ الماس خانم اس قصہ کو سنکر پھولی نہ سمائیں۔ ساس کو پیٹھ پر لاد کر اور تینوں تھیلیوں کو بغل میں مار کر گھر لائیں۔ انہیں نرم بچھونے پر لٹایا۔ گرم گرم حریرہ بنا کر پلایا۔ اور چوٹوں پر چاکجا ہلدی پیس کر اور گرم کر کے لگائی، اور صبح اُٹھ کر اُن کے لئے سٹورہ بنایا۔ اور اپنی خطا معاف کرائی۔

الماس خانم کی ماں رشک وحسد کا پتلہ تھیں۔ وہ بی عزت نساء کے اس طرح روپیہ لانے پر جل مریں۔ اور سوچنے لگیں کہ کسی طرح میں بھی ان تینوں موسلوں سے انعام حاصل کروں۔ آخر اُن سے ضبط نہ ہوا۔ ایک دن انہوں نے بیٹی کو

الگ لے جاکر کہا۔ بیٹی ماشو! (الماس خانم کا بچپن کا نام ہے) یہ تو روپیہ پیدا کرنے کا بڑا اچھا ڈھنگ ہے۔ تو جانتی ہے۔ میں بھی مفلس کنگال ہوں۔ آج رات کو تو مجھے مار کوٹ کر جنگل میں پھینک آ۔ خدا چاہے میں تیری ساس سے دُگنا مال لے کر آؤں گی۔ الماس خانم نے ماں کو بہت سمجھایا۔ مگر وہ تو پیسے کے لالچ میں اندھی ہو رہی تھی۔ بیٹی کے سمجھانے کا کچھ بھی خیال نہ کیا۔ اور اس سے یہی کہا کہ تو بی عزّت کی طرح مجھے مارتے مارتے کچومر نکال دے۔ اور جنگل میں پہنچا۔ ناچار ہو کر سعادت مند بیٹی الماس خانم نے یاقوت خانم کو لنگر کے بلاؤ کی طرح خوب ہی مار دی۔ اور اُس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رات کو جنگل میں پھینک آئی۔ جب آدھی رات اِدھر آدھی اُدھر ہوئی، تو جاڑہ، گرمی، برسات کی روحانیت یاقوت خانم کے پاس آن پہنچی۔ اور کل کی طرح سب سے پہلے جاڑے نے بڑھ کر کہا:۔ "اے بڑھیا! میں کیسا؟"

یاقوت خانم۔ خدائی خوار گدھے سوار۔ پہلے تو اپنا نام و نشان بتا۔ مجھے کیا خبر تو کون بلا ہے۔ پھر میں جواب دوں گی۔

جاڑہ۔ میں جاڑہ کا موسم ہوں۔

یاقوت خانم۔ اے خدا تجھے غارت کرے۔ کم بخت تو بڑا منحوس ہے غریب آدمی گرمی کے اندر تو ایک چھپڑے میں بھی گزارہ کر لیتے ہیں۔ مگر تیرا منہ بے روئی دار کپڑوں کے نہیں جھلسا جاتا۔ پانی میں اولے جیسی ٹھر پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ منہ دھویا جا سکے نہ نہانے کا حوصلہ۔ لوگ وضو کرنے نماز پڑھنے سے جی چراتے ہیں، اور جو ٹھنڈے پانی سے وضو کیا جاتا ہے تو ہاتھ پاؤں پھٹتے ہیں۔ موم روغن

اور پھلوا ملنے کو کہاں سے لائے۔ ہر کام سے آدمی سردی میں گھبراتے ہیں۔ عورتیں دال دھوتی ہیں۔ آٹا گوندھتی ہیں تو مارے سردی کے ہاتھ اکڑ جاتے ہیں۔ پانی گرم کرکے کام کریں تو دوگنا اینڈھن درکار ہوتا ہے۔ ٹھنڈے پانی سے نہاتی ہیں۔ تو نزلہ زکام ہو جاتا ہے۔ بال سکھانے کی مصیبت پڑتی ہے۔ بچوں کو بھیگے سردودھ پلادیتی ہیں۔ تو اُن کا جی الٹنا ہو جاتا ہے۔ بخار چڑھتے ہیں پسلی کا خلل ہوتا ہے۔ پیٹ میں ہرا ہو جاتا ہے۔ بڑے آدمی ذات الجنب میں مرتے ہیں۔ دن چھوٹے ہوتے ہیں۔ کوئی کام پورا نہیں ہوتا۔ دھوبی سقے چار مہینے تک کوستے ہیں کہ خدا جاڑے کا جلدی سے منہ کالا کرے۔ اس نے ہمیں ستا دیا۔ دریا کے ٹھنڈے پانی میں کپڑے دھونے کے لئے کیونکر گھسا جائے۔ ٹھنڈا پانی مشک میں کیونکر بھرا جائے۔ پھر ٹھنڈی مشک کو کس طرح اٹھا کر لے جائیں۔ سردی کی ایک مصیبت یہ بھی ہے۔ کہ اگر سفر کیا جاتا ہے۔ تو اوڑھنا بچھونا روئی دار لیجانا پڑتا ہے۔ جس کا لے جانا دشوار ہوتا ہے۔ روٹی توے سے اُتری اور ٹھنڈی۔ ہانڈی میں پتیلی میں دال سالن برف کی طرح جم گیا کھاؤ تو معلوم ہوتا ہے۔ ٹھنڈی مٹی کھا رہے ہیں۔ کپڑوں میں جوئیں پڑجاتی ہیں۔ اور رات دن ستاتی ہیں۔

یاقوت خانم ابھی جاڑے کے بارے میں اور کچھ کہنا چاہتی تھیں جو گرمی کے موسم نے بڑھ کر کہا بس بڑھیا بس! تو نے میرے بھائی کی بہت ہجو کی۔ اچھا اب یہ بتا میں کیسا ہوں؟

یاقوت خانم بستیا ناسی میری بیزار کو بھی معلوم نہیں کہ تو کون سے

کی ہوئی ہے۔ اپنا نام ونشان کچھ مجھے بتا تو میں کہوں تو ایسا ویسا ہے۔

گرمی۔ میں گرمی کا موسم ہوں۔

یاقوت خانم۔ اے گرمی تجھے خدا کی پھٹکار۔ خدا تیرا ستیاناس کرے۔ گرمی کا دکھڑا کیا روؤں۔ پسینے پر پسینے چلے آتے ہیں۔ پسینہ کی تیزی سے کپڑے میلے بھی ہوتے ہیں۔ اور گل بھی جاتے ہیں۔ نہ باسی پانی ٹھنڈا ہو نہ تازہ۔ جب پیو گرم حلق سے اترنا دشوار۔ دال سالن اور سب کھانے شام سے صبح اور صبح سے شام نہیں بگڑتے۔ سڑ جاتے ہیں۔ بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ چولھے کے پاس بیٹھ کر کھانا پکانا مشکل، لپٹ کے مارے تن بدن جلا جاتا ہے۔ دھواں آنکھوں میں گھسا جاتا ہے۔ گرمی کے مارے بچوں کو تونس ہوتی ہے چیچک، موتی جھارا نکلتا ہے اور اپنی ماں کے لال اس گرمی کی بدولت قبر میں جا سوتے ہیں۔ تَل تنخیری دھوپ میں مسافر بیچارے راہ چلتے اور بیمار پڑتے ہیں۔ سرسام ہوتے ہیں گرمی کے موسم میں رمضان شریف آ گئے تو پھر انسان کا جینا دشوار۔ مگر اللہ کے پاک بندے روزہ ناغہ نہیں کرتے۔ اللہ کے فرض کے پیچھے اپنی جانیں دیدیتے ہیں روزہ کھول کر پانی زیادہ پی گئے۔ کلیجے میں درد اُٹھا۔ مر گئے۔ کسی بچہ کو روزہ رکھوایا۔ اُس کا دانہ پانی بند ہوا تو بچہ بلبلا کر ہاتھوں میں آ گیا۔ مارے پیاس کے اس کی آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے۔ روزہ کھول کر سنبھل گیا تو سنبھل گیا۔ نہیں عید سے پہلے محرم ہو گیا۔ مجھے گرمی کے عیب بہت یاد ہیں۔ مگر درد اور چپک کے مارے مجھ سے اچھی طرح بولا نہیں جاتا ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے گرمی اپنا سامنہ لے کر سرک گئی۔ اور برسات نے اپنے ان دونوں ساتھیوں

سے کہا۔ ذرا ٹھہر۔ میں بھی اس ڈائن بد زبان سے دو دو باتیں کر لوں۔

برسات۔ اے بڑھیا میں کیسا؟

یاقوت خانم۔ اے جوانا مرگ، اموئے مونڈی کاٹے۔ پہلے یہ تو منہ سے پھوٹ کہ تو کون ہے؟

برسات۔ میں ہوں برسات کا موسم۔

یاقوت خانم۔ اللہ تجھ سے بچائے، برسات موئی آفت کی پڑیا ہوتی ہے۔ سردی گرمی میں آدمی پیڑ تلے۔ ٹٹی تلے بیٹھ کر زندگی بسر کر سکتا ہے مگر تجھے چاہئیں نیگلے چھتیں۔ ڈھیا پھوٹی تو ہی لاتی ہے۔ گاؤں اور شہر تو ہی بہا کر لے جاتی ہے۔ رعد کی کڑک تو لے کر آتی ہے۔ بجلیاں تو ہی گراتی ہے۔ سانپ بچھو، کھنکھجورے۔ اور ہزاروں قسم کے زہر دار کیڑے تو ہی پیدا کرتی ہے۔ مچھروں سے تو کٹواتی ہے۔ پسوؤں سے تو نچواتی ہے۔ ملیریا بخار اور ہیضہ تو پھیلاتی ہے مکھیاں تو ہی بھنکواتی ہے۔ سڑی گرمی برسات کی ہی کہلاتی ہے۔ تو بڑی بے رحم ہے۔ قحط تو ہی ڈالتی ہے۔ بھوکا مارتی ہے۔

جب یاقوت خانم بکواس کر چکی تو تینوں موسموں نے آپس میں صلاح کی کہ اس بے حیا عورت کو ایسی سزا دینی چاہئے۔ جو ہمیشہ قائم رہے اور لوگ اسے دیکھ کر عبرت پکڑیں۔ یہ کہکر جاڑا آگے بڑھا اور اس نے یاقوت خانم کی ناک جڑ سے کاٹ لی۔ پھر گرمی نے ایک کان اسکا بے نشان کر دیا۔ پھر برسات نے اس کا دوسرا کان تراش لیا۔ اور یاقوت خانم کو بُرا بھلا کہتے چلے گئے۔

رات کے تین بجے الماس بیگم اس خیال میں ڈوبی ہوئی اپنی ماں کے

پاس پہنچیں کہ چھ ہزار کی رقم وہ اپنے پیٹ سے لگائے بیٹھی ہوں گی۔ مگر جا کر دیکھا کہ بڑی بی مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہیں۔

الماس خانم نے کہا۔ "اماں جان خیر تو ہے؟"

یاقوت خانم - خیر کیسی کمبخت تو مجھے گھر لے چل۔ وہاں پہنچ کر اپنی بپتی تجھے سناؤں گی۔ الماس خانم اماں جان کو ڈولی پر چڑھا کر گھر میں لے آئی۔ اور چراغ کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اماں کی ناک نہیں ہے۔ اس نے اپنے سینہ میں ایک گھونسا مارا اور کہا۔ "ہائے اماں جان! تمہاری ناک کہاں گئی۔"

یاقوت خانم نے سارا حال بیان کیا۔ اور کہا بیٹی! یہ سمدھن کا صبر میری جان پر پڑا ہے۔

"مت کر ساس برائیاں تیرے آگے بھی جائیاں۔"

صبح کو ہمسایہ کے بچوں نے یاقوت خانم کو نکٹی، بوچی دیکھ کر ہنسی اڑائی۔ اور سارے شہر میں تھڑی تھڑی ہوئی۔

خدا ہم فقیروں کو ایسی طمع سے بچائے۔ جس میں ناک کان کی جوکھوں ہو۔

تغلق آباد کا سُنار

اس وقت کے کھنڈر تغلق آباد کا ذکر نہیں ہے لیکن غیاث الدین تغلق کے عہد کا تغلق آباد جس میں ساری دلی کی آبادی سما رہی تھی۔ اور جو آج اس شاہجہاں آباد اور رائے سینہ میں لہر بہر دیکھتے ہیں۔ یہ سب تغلق آباد میں پائی جاتی تھیں۔ مگر جمنا داس سُنار کی بدنصیبی دیکھئے۔ سات پشت کا کاریگر جس کے باپ دادا بادشاہزادیوں اور بیگموں کے لئے گہنے بناتے تھے اور انعام پاتے تھے۔ یہ فاقہ کرتا تھا۔ اس کی دکان بیچ جوہری بازار میں تھی۔ آس پاس کے بیٹھنے والے سُنار جو بالکل اناڑی تھے۔ دن رات روپیہ رولتے تھے اور یہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تھا۔ دوسرے تیسرے دن اس کے پاس کام آتا تھا۔ تو بس اتنا کہ یہ اور اس کی جورو درگا بائی مشکل سے دو وقت جو کی سوکھی روٹی کھالیں۔ اور دو تین دن تابڑ توڑ فاقہ کریں۔ اور کپڑے لتے کا نصیب ہونا دشوار تھا۔ درگا بیچاری کے لہنگے میں پیوند۔ دوپٹہ بور بور، اور انگیا کرتی تو پہننی بھول ہی گئی تھی۔ ننگے گلے ننگے پیٹ پرانے دھرانے دوپٹہ سے آگا پیچھا ڈھانک لیتی تھی۔ جمنا داس کی دہوتی اور پگڑی تار تار۔ گلے میں پھٹا ہوا کرتہ میلا کچیلا پھر اس پر طرہ یہ کہ بے اولادی پچاس برس کا جمنا داس ہوگیا۔ اور چالیس برس کی درگا۔ ان کے ہاں چوہے کا بچہ بھی نہ ہوا۔

جمنا داس جب رات کو آتا چوتھے پانچویں دو تین آنے کے پیسے لاتا جو ان دونوں دموں کے لئے بہت ہوتے۔ مگر جیت یہ تھی کہ اناج اور ترکاری اور سب جنس سستی تھی۔ اسی تنگی ترشی میں درگا جی کا پاؤں بھاری ہوا۔ اور ایشور کی کرپا دیکھئے نویں مہینے لڑکا پیدا ہوا۔ بوڑھے منہ مہاسے اور لوگ چلے تماشے۔ جب درگا پیٹ سے تھی تو پاس پڑوس کی عورتیں چپکے چپکے کہا کرتی تھیں۔ مالک خیر کرے پچیس برس کی عمر تک اگر عورت کے ہاں بال بچہ نہیں ہوتا ہے۔ تو اس کا ہاڑ سے ہاڑ جڑ جاتا ہے۔ جب اس عمر گئے پیٹ رہتا ہے۔ تو عورت کو جتنا مصیبت ہوتا ہے۔ یا تو پیٹ میں بچہ مر جاتا ہے۔ یا زچہ سدھار جاتی ہے۔ کیونکہ اس پکی عمر میں تکلیف کی سہار نہیں ہوتی۔ مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ درگا دیوی پلنگ کو لات مار کر کھڑی ہو گئیں۔ اور بال بھی بیکا نہ ہوا۔ پنڈت جی مہاراج نے بالک کا راس دیکھ کر جنم پترہ بنایا اور گوپال داس نام لکھ کر اور دو ٹکے لے کر تشریف لے گئے۔ یہ بچہ ایسا دلدری ہوا کہ جمنا داس کے گھر کی رہی سہی برکت جاتی رہی۔ مکان ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر ہو گیا۔ اور اس کے باپ نے پھونس مانگ تانگ کر ایک چھپر ڈال لیا۔ اور اس میں یہ بچہ اور اس کے ماں باپ اپنی زندگی کاٹتے۔ اس مصیبت اور تکلیفوں میں گوپال بارہ برس کا ہو گیا۔ اور اس کے ماں باپ بوڑھے ہو کر حلوہ بن گئے سر سفید۔ داڑھی سفید۔ دانت ٹوٹ گئے۔ پنڈلوں پر جھریاں پڑ گئیں آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگا۔ پھر اس پر روٹی کی مار سردی اور گرمی اور خاصکر برسات پرانے چھپر تلے کاٹنی معاذ اللہ درگا کی یہ مصیبت دیکھ کر ایک مسلمان پڑوسن

نے اس سے کہا۔ یہ پہاڑ جو تغلق آباد سے جھکو کھاتا ہوا گوڑ گانوہ کی طرف چلا گیا ہے۔ اس میں دس میل پر ایک کھوہ ہے۔ اُس میں ولی اللہ ایک مسلمان رہتے ہیں۔ جو وہ کہہ دیتے ہیں۔ وہ ہو جاتا ہے۔ ہزاروں ہندو، ہزاروں مسلمان اُن کے پاس جاتے ہیں۔ اور اپنی اپنی مرادیں پاتے ہیں۔ جسے وہ دعا دیتے ہیں۔ وہ نہال ہو جاتا ہے۔ نگوڑی تو بھی اُن کے پاس جا۔ اور اپنے گھر والے اور اپنے بچے کو بھی ساتھ لے جا۔ ہاتھ پاؤں جوڑنا۔ اور اپنی رام کہانی انہیں سُنانا۔ خدا چاہے۔ تو سب بھرے پُرے پلٹ کر آؤ گے۔ پڑوسن کی بات درگا کے جی کو لگ گئی۔ اور اُس نے دو چار ہندو عورتوں سے بھی سنا کہ مسلمان فقیر سچ مچ پہنچے ہوئے آدمی ہیں۔ اور کچھ رات رہے بوڑھی سناری اپنے خاوند اور اپنے بچے کو لے کر بستہ پر چل دی۔ تینوں کے تینوں بھوکوں کے مارے کمزور اور بودے ہو رہے تھے۔ ایک ایک قدم انہیں منزل تھا۔ پہاڑیوں پر دوڑنے پھرنے سے پاؤں لہو لہان ہو گئے۔ مگر گرتے پڑتے فقیر صاحب کی کھوہ تک پہنچ ہی گئے۔ جو سُنا تھا اس سے زیادہ وہاں حاجت مندوں کی بھیڑ لگی ہوئی دیکھی۔ فقیر صاحب پتھر کی چٹان پر ایک بوریا بچھائے بیٹھے تھے اور تعویذ گنڈے دے رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے جس کسی کو کہنا سننا ہو وہ جلدی کہہ لے۔ میری اللہ اللہ میں ہرج ہوتا ہے سنار اور سناری فقیر کی نورانی صورت دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور انہوں نے آپس میں کہا۔ بیشک یہ منہ مانگی مرادیں دیں گے۔ جب بھیڑ ہو گئی۔ تو فقیر صاحب نے ان سے بھی کہا بابا جو تمہارا مطلب ہو وہ کہہ ڈالو۔ جمنا داس نے کہا حضور ہم اپنی بات اکیلے میں کہنی چاہتے ہیں۔

فقیر صاحب نے کہا۔ تو ظہر کے وقت تک ٹھہرو۔ اس وقت تک یہاں کوئی
نہ رہے گا۔ پھر جو تمہارا جی چاہے وہ کہنا۔ یہ کہہ کر فقیر صاحب لوگوں کو تعویذ
فلیتہ بانٹنے لگے۔ یہاں تک کہ سب لوگ چلے گئے۔ فقیر صاحب نے ظہر
کی نماز ادا کی۔ اور جمنا داس سے کہا ہوں۔ بولو۔ کیا چاہتے ہو۔ جمنا داس
اور اس کی بیوی اور اس کا بارہ برس کا لڑکا فقیر صاحب کے قدموں پر گر پڑے
اور سب نے مل کر اپنی بیکسی، نحوست کا حال اس طرح عرض کیا کہ فقیر صاحب
کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ اور آپ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں
اور مراقبہ میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد آنکھیں کھول کر ان سے کہا۔ اللہ تم
تینوں کے حال پر رحم کرے گا۔ کان کھول کر سن لو۔ فقیروں کے بس میں
کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی کو دے سکتے ہیں۔ نہ کسی سے کچھ چھین سکتے ہیں
دینا اور نہ دینا یہ اسی داتا کے گن ہیں۔ جو سنار کا پالنے والا ہے۔ مجھے تو
بس اتنا حکم ملا ہے کہ ان تینوں آدمیوں سے کہہ دو کہ تم تینوں کی ایک ایک
دعا قبول ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی آن کی آن میں جو مانگو گے وہ فوراً پاؤ گے
مگر دوبارہ دعا کام نہ دیگی۔ اب تم اپنے گھر جاؤ۔ اور سوچ سمجھ کر دھن دولت
ہاتھی گھوڑے جو کچھ مانگنا ہو۔ مانگ لینا اسی وقت مل جائے گا۔ اور تمہارے
دلدر پار ہو جائیں گے۔ لو اب سواری بڑھاؤ۔ یہ تینوں فقیر صاحب کے ہاتھ
پاؤں چوم کر تغلق آباد کو چل دیئے۔ اور مارے خوشی کے اپنے جامے میں پھولے
نہ سماتے تھے اور اپنے جی میں الگ سوچتے چلے جاتے تھے کہ ہمیں خدا سے
کیا مانگنا چاہیئے۔ بوڑھیا سُناری کے دھیان میں یہ بات آئی کہ میرا بوڑھا

گھروالا دلی کی سلطنت خدا سے مانگے گا۔ اور اسے فوراً دلی کی سلطنت مل جائیگی اور پھر اس کے اوپر سینکڑوں بادشاہ زادیاں اور کنواری کنیاں پریزاد سے پریزاد واری اور قربان ہوں گی۔ اور مجھ کھوسٹ بوڑھیا کو جس کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ہے کبھی بھول کر نہ پوچھے گا۔ اور راجہ اندر بن جائے گا۔ اس لئے میرے لئے یہ مناسب ہے کہ پہلے سے اس کا توڑ کروں۔ اور دعا کی برکت سے راج دلاری اور خوبصورت اور کنواری لڑکی بن جاؤں تاکہ جمنا داس بادشاہ بنتے ہی میرے اوپر عاشق ہو جائے۔ اور مجھے اپنی بڑی رانی بنائے اس خیال کے آتے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ کہ اے ایشور! اے پرماتما! تو مجھے چودہ برس کی کنواری کنیا اور البیلی بنادے کہ جو مجھے دیکھے مجھ پر موہت ہو جائے۔ اور میرا دم بھرنے لگے۔

کامل فقیر کا کہنا سچا تھا۔ دعا کرتے ہی بوڑھی سناری ایک حور بہشتی یا پرستان کی پری بن گئی۔ اور بوڑھے خاوند کو اپنے ناز و انداز دکھانے چلی۔ اتفاق کی بات ادھر سے شاہنشاہ دہلی کا ولی عہد بادشاہ زادہ ہرن کے پیچھے گھوڑا مارے چلا آتا تھا۔ جو ان کے پاس آن پہنچا۔ اور اس کی درگا دیوی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بادشاہزادے نے درگا کے پاس گھوڑا لاکر کہا۔ بیا۔ درگا ہرنی کی طرح چھلانگ مار کر اس کے گھوڑے کے پاس پہنچی۔ بادشاہ زادے نے کہا۔ جان من! گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھ کر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے۔ اور نازنین سناری کو اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا۔ گھوڑے کو ایڑ دیتا ہے۔ تو یہ جا وہ جا۔ بوڑھا سنار اور اس کا نادان

لونڈا ہکا بکا کہ ابھی یہ چھلاوہ کہاں سے آیا۔ جو درگا کو چھین کر چمپت ہوا۔ بوڑھے سنار نے جورو کی جو یہ بیوفائی دیکھی جل مرا۔ اور اس نے کہا ٹھیر تو جا چڑیل! مجھے چھوڑ کر تو بادشاہزادے کے ساتھ سیج پر سوئے، یہ نہیں ہو سکتا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ چلا کر کہا اے خدا! اے داتا! بس میری یہی دعا ہے کہ یہ جو درگا بادشاہزادے کے ساتھ گھوڑے پر چلی جاتی ہے اس کو تو سورنی بنادے۔

ولیعہد اپنے گھوڑے کو بھگائے چلا جاتا ہے۔ اور ارمان کے مارے اپنی معشوقہ کے مکھڑے کو دیکھتا جاتا تھا۔ جو ایک دفعہ اس نے دیکھا جو زین پری میرے آگے زرین غاشیہ پر کالی کلوٹی کیچڑ میں لتھڑی لتھڑائی ایک سورنی بیٹھی ہے۔ اور میں اسے دونوں ہاتھوں سے تھام رہا ہوں۔ اور اس کے بینڈے کے سخت سخت بال ہاتھوں کو زخمی کئے دیتے ہیں۔ اس تماشے کو دیکھ کر ولیعہد نے گمان کیا کہ اس جنگل میں چھلاوہ رہتا ہے۔ پہلے ہرن بنکر میرے سامنے آیا۔ پھر پری بن گیا۔ اب سورنی بن کر ڈراتا ہے۔ یہ سوچ کر ولیعہد نے فوراً سورنی کو دھکیل کر نیچے گرادیا۔ اور گھوڑا بھگا کر لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔

درگا بائی سورنی کی جون میں جنگل کے اندر حیران کھڑی تھی۔ اور دن ڈگڈگیوں رہ گیا تھا۔ پہاڑیوں پر جو درخت تھے ان کی پھننگ پر زرد مہین دھوپ کچھ باقی تھی۔ جو اس میں جمنا داس اور گوپال داس سورنی کے پاس پہنچے۔ جمنا داس کا جی جل رہا تھا۔ وہ غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے

آتے ہی دونوں ہاتھ سے ایک لٹھ سورنی کی کمر پڑ ٹکا دیا۔ اور وہ قیں قیں کرکے چیخی۔ اور بوڑھے کے پاؤں پر لوٹنے لگی۔

جب جمنا داس نے مارتے مارتے اس کا کچومر نکال لیا۔ تو گوپال اس سے کہا۔ یہ تیری میا ہے جس کے لئے تو پھڑکا جاتا تھا۔ اور یہ جوان مردوے کے ساتھ بھاگی تھی۔ اب ایک دعا تیری اور ہے۔ وہ تو اپنی ماں کے کام میں لا۔ اور اسے آدمی بنا۔ یہ سن کر سورنی گوپال کے پاؤں پر آپڑی۔ اور اس کے صدقے واری ہونے لگی۔ جس کے یہ معنی تھے کہ میرے لئے دعا کر اور میں جیسی کی تیسی سناری بن جاؤں۔ گوپال نے اپنی ماں پر ترس کھا کر دعا کی۔ اور وہ بوڑھی سناری بن گئی۔

رات کے بارہ بجے یہ تینوں اپنے جھونپڑے میں پہنچے۔ صبح کو مسلمان پڑوسن نے درگا سے پوچھا کہ تمہیں فقیر صاحب کے یہاں سے کیا ملا۔ درگا نے اپنی ساری کہانی اسے سنائی۔ اور کہا۔

"بہن تم نے جو کہا تھا۔ وہ سب سچ نکلا۔ مگر پوت گئے دکھن اور وہی کرم کے لچھن۔ خدا کی بے مرضی نہ فقیر کسی کو کچھ دے سکتا ہے نہ بادشاہ مگر لوگوں کو خبط ہوتا ہے کہ میں اور میرا سارا کنبہ کایا پلیٹ ہو جائے۔ اور ہم دن رات جشن جمشیدی کیا کریں۔ مگر وہ منہ دھو رکھیں۔"

لال قلعہ کے نیچے گولڈن ہارن

نہ گیا کوئی عدم کو ، دل شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لیکر

صدیاں اور قرن ابھی نہیں گزرے۔ بلکہ کچھ دنوں کی بات ہے کہ ترپولیہ سے گزر کر دریائے جمنا کی سنہری شاخ لال قلعہ کی قدمبوسی کرتی ہوئی زینت المساجد کے نیچے آتی تھی۔ اور زینت المساجد کے پاس جو فصیل ہے کھڑکی لگی ہوئی ہے۔ اس کے پاس سے ہوتی ہوئی آگے جاکر دریا میں مل جاتی تھی۔ کھڑکی سے بس کوئی سو قدم جاکر ایک کنواں تھا۔ اور کنوئیں سے اُتر کی طرف پانی میں اینڈ پڑتی تھی۔ بڑے بڑے تیراک اور نہانے والے یہاں پیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اینڈ میں پھنس کر استاد تو نکل ہی جاتے تھے۔ اور اناڑی ڈوب کر مر جاتے تھے۔

مسجد گھاٹ سے لے کر ترپولیہ تک نہانے دھونے والوں کے جھومر کے جھومر اور جھلڑ کے جھلڑ دکھائی دیتے تھے۔ اور لال قلعے کے جھروکوں کے نیچے جو آب رواں کی لطافت تھی وہ کہتی تھی کہ میں کبھی حسن مغلیہ کے فوٹو کی پلیٹ رہ چکی ہوں۔ مجھ میں زیب النساء اور جہاں آرا، اور عالم آرا۔ اور ممتاز محل کے سراپا کا عکس پڑا ہے۔ اس شاخ زریں کے کنارے مچھلی پکڑنے والے شست اور کانٹا

دریا میں ڈال کر اپنے محبوب کے تصور میں کنارے پر غرق رہتے تھے۔ کانٹوں میں کبھی ٹری سی پاتل آپھنستی تھی۔ تو اُس کا دریا سے نکلنا قیامت ہوتا تھا۔ کانٹا الگ خراب ہوتا تھا۔ ڈور جدا ستیاناس ہوتی تھی۔ فقیر فراق بارہ دری میں بیٹھے بیٹھے اشراقی نظر سے یہ تماشے دیکھا کرتا تھا۔

ایک بار میری آنکھوں کے سامنے یہ سماں آیا کہ شمس برج کے نیچے پھنکیتی کے اُستاد مچھلی کے شکار میں مشغول ہیں۔ اور ان کے ادھر اُدھر اور بھی کئی شکاری مچھلی کا شکار کھیل رہے ہیں۔ اور کانٹے دریا میں ڈالے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ شاہدرہ کی طرف سے سورج نکل رہا ہے۔ اور شفق اور سورج کا عکس پانی میں عجب بہار دے رہا ہے۔

ناگہاں ایک شخص دراز قد میلے کپڑے پہنے، اونچی سی دھوتی باندھے بغل میں ایک توشک کے اندر موٹی سی کوئی چیز لپیٹے دریا پر پہنچا۔ اس شخص کے پیچھے ایک لہنگے والی عورت تھی۔ عورت کی گود میں کوئی ساڑھے تین برس کا بچہ تھا۔ اور کوئی پانچ برس کا بچہ اُس کے ساتھ تھا جس کی انگلی وہ پکڑے ہوئے تھی۔

شکاریوں نے ان دونوں زن و مرد اور دونوں بچوں کو نگاہ غلط انداز سے دیکھا۔ اور آنکھیں نیچی کر کے اپنے اپنے کانٹوں کو گھورنے لگے کہ اتنی سی غفلت میں مچھلی کانٹے کو لیکر چل تو نہیں دی۔

اُس شخص نے اپنی لپٹی ہوئی توشک کو دریا میں زور سے پھینک دیا۔ توشک کے دریا میں گرتے ہی۔ پانی کے اندر ایک دھما کا ہوا۔ اور اب سب

شکاریوں نے چوکنا ہو کر دیکھا کہ اس شخص نے دریا میں کیا چیز پھینکی اور اس میں
تو شک دریا پر تیر کر بہنے لگی ۔ اور اس کے نیچے سے کالے کتے کی لاش ابھر کر
پانی پر آئی ۔ اور پانی کا بہاؤ اُسے لے چلا ۔

کتے کی لاش کو دیکھ کر وہ اجنبی شخص آہ و فغاں کرنے لگا ۔ مرد کو روتا دیکھ
کر لہنگے والی عورت بھی بیان کرکے رونے لگی ۔ ماں باپ کو روتا دیکھ کر دونوں
بچے بھی بلک بلک کر رونے لگے ۔

سننے والوں کو اس عورت کے بیان سے یہ معلوم ہوا کہ ان دونوں
میاں بیوی نے اس کتے کو چھوٹا سا پالا تھا ۔ اور یہ دونوں اور ان کے بچے
اس کتے سے بہت مانوس تھے ۔ اور کتا بھی ان سب پر اپنی جان دیتا تھا ۔
قضا الٰہی سے یہ فوت ہو گیا ۔ اور یہ لوگ اپنے یار وفادار کی لاش کو سپرد دریا
کرنے آئے ہیں ۔ کتے کو بے کسی اور بے بسی میں دریا کی تھپیڑیں کھاتا دیکھ کر
ان کا جی بھر آیا ہے ۔ اور عورت کتے سے مخاطب ہو کر کہہ رہی ہے ۔

پیارے تیری جدائی شاق ہے ۔ مگر کیا کریں ۔ تو رہنے سے مجبور ہے
اور ہم تجھے رکھنے سے معذور ہیں ۔ ہم نے تجھے بڑے لاڈ سے پالا تھا ۔ مگر یہ
نہ معلوم تھا کہ تو بھی بیمار ہو کر مر جائے گا ۔ اور ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے ۔

پھنکیتی کے استاد نے جب ان سوگواروں کے رونے کا بھید سمجھا تو
یہ ماہی بے آب کی طرح بے قرار ہو گئے ۔ کیونکہ حضرت کا دل ایک قتالہ عالم
پر آیا ہوا تھا ۔ اور وہ کافر انہیں تڑپتا چھوڑ کر اغیار کے ساتھ آگرہ کو
چل دی تھی ۔

اِن میاں بیوی کے تعلق کو دیکھ کر غیرت و حیا نے استہزاء کے طور پر
چٹکی لی۔ اور درون سینہ سے اُن کے کان میں آواز آئی۔ کہ اے انسان!
تو نے عشق کے کرشمے کو دیکھا کہ یہ انسان اور حیوان سے سا لگا جوڑ دیتا ہے
اور آدمی پر آدمی مرنے لگے تو کچھ تعجب کا موقعہ نہیں ہے۔ اگر آدمی کی معرفت
کے کان کھل جائیں تو اُسے معلوم ہو کہ صدا آ رہی ہے کہ انسان و حیواں کیا بشّش
سے کائنات کا کوئی ذرہ اور دریا کا کوئی قطرہ محبت و اُلفت سے خالی نہیں ہے
اور جب آدمی عشق و اُلفت سے خالی ہو۔ تو وہ خاک اور دھول سے بدتر ہے ؛

زباندانی

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

ایس، ڈبلیو فیلن صاحب انسپکٹر مدارس حلقہ بہار کو اردو زباندانی کا
بڑا شوق تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے گورمنٹ کو توجہ دلائی تھی۔ کہ اردو زبان کی
ایک ڈکشنری ایسی مرتب کرائی جائے جو یورومین لوگوں کے لئے ہادی اور
چراغ ہدایت ہو۔ اور فیلن صاحب ہی اس کام کے لئے منتخب کئے گئے تھے
اور اردو لغت کی تالیف کے وقت انہوں نے اپنی مدد کے لئے منشی سید احمد
صاحب فرہنگ آصفیہ منشی چرنجی لال صاحب مؤلف مخزن المحاورات،

اور منشی فیاض الدین صاحب کو لیا تھا۔ منشی فیاض الدین مرزا الٰہی بخش صاحب
بادشاہزادہ گورگانی کی سرکار میں ناخن ہندی رکھتے تھے۔ اور لال قلعہ کی آخری
بہار، بہادر شاہ کے دربار انہوں نے خوب دیکھے تھے۔ اور بزم آخر منشی صاحب
نے اسی باعث سے عجیب و غریب خوب لکھی ہے کہ لال قلعہ اور بادشاہ کو
انہوں نے سالہا سال دیکھا تھا۔

فیلن صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ پٹنہ عظیم آباد سے دلی آئے تھے۔ ان کے
یہ لائق فائق حواری یا مددگار قلم دوات، کاغذ پنسل لیکر ان کے ساتھ ہوتے تھے
اور دلی کے گلی کوچوں میں ڈانواں ڈول پھرا کرتے تھے۔ فقط محاوروں کی چاہ
میں، کبھی زردوزوں کے، کبھی دبکیوں کے، کبھی کندلا کشوں وغیرہ پیشہ وروں
کے کارخانوں میں گھس جاتے۔ جو جو اوزار یا سامان اس کارخانے میں پاتے تھے
اُن کے ناموں کی پوچھ گچھ کرتے تھے۔ اُن کے کاموں کی اصطلاحوں کی چھان
بین کرتے تھے۔ اور مددگار کوئی ناگری میں کوئی انگریزی میں کوئی اردو میں
ان الفاظ، ان محاورات، ان اصطلاحوں کو لکھتے جاتے تھے۔

فیلن صاحب کو میرزا رجب علی صاحب سرور کا فسانہ عجائب پڑھتے
پڑھتے حفظ ہو گیا۔ میر امّن دہلوی کا چار درویش بھی نوک زبان تھا۔ کبھی
چاندنی چوک میں جوتہ والوں سے بحث ہو رہی ہے۔ کہ بھکلائی اور کسوں کے
کیا معنی ہیں۔ ٹاٹ بافی کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ کبھی نان بائی کی دکان پر نہاری
اور خمیری کے خمیر اور مصالحہ کی تحقیق کر رہے ہیں۔ کبھی فتحپوری کے میوہ
فروشوں اور کنجڑوں سے بات کر کے اپنا دل ہرا کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ

چو میرد مبتلا میرد۔ چو خیزد مبتلا خیزد۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک وہ اور اُن کے اسسٹنٹ اُردو بول چال کی تصحیح کرتے رہتے تھے اسی طرح مسٹر فیلن لکھنؤ جاکر مہینوں پڑے رہتے تھے۔ اور وہاں کی بولی کی بھی ارباب کمال سے چھان پھٹک فرمایا کرتے تھے ؎

کفر گیرد کافر ملت شود
ہر چہ گیرد علتی علت شود

فیلن صاحب اردو زبان پر حاوی ہو گئے تھے۔ ان کا لب و لہجہ بھی اردو بولنے میں سنور گیا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھروسہ ہو گیا تھا کہ میں اردو اہل زبان کی طرح جان گیا ہوں۔ اور اس کی وہ ہر طرح جانچ کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی خیال میں وہ دلی کے کسی کوچہ سے گزر رہے تھے۔ جو انہوں نے دیکھا کہ ایک حلال خوری اپنے ڈھیلے پائنچوں کو باندھے کانوں میں موتیا کے پھول پہنے کلہ میں پان کی گلوری دبائے کوٹھے پر ٹوکرہ رکھے چلی آتی ہے۔ فیلن صاحب خوب جان گئے تھے کہ دلی کی حلال خوریاں پاک اردو بولتی ہیں۔ اُس سے کہنے لگے۔ "کیوں بی مہترانی میں فرنگی ہو کر سچ کہنا کیسی اُردو بولتا ہوں؟"

مہترانی بولی۔ "صاحب میرے کوٹھے پر بوجھ ہے۔ اسے ذرا ڈلاؤ پر ڈال آؤں تو میں آپ کا امتحان لوں گی۔ اور سچ سچ بتا دوں گی کہ آپ کو اردو آگئی یا نری دون کی لیتے ہیں۔"

صاحب نے کہا۔ میں کھڑا ہوں۔ تم کام کر کے پلٹ آؤ۔ حلال خوری پلٹ آئی۔ اور فیلن صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی:۔

"بھلا صاحب! بتایئے توسہی ہمارے شہر میں "چہرے کی لینی" کسے کہتے ہیں"۔ یہ نئی اصطلاح سُن کر فیلن صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ اور حلال خوری کے سامنے بغلیں جھانکنے لگے۔ جب فیلن صاحب سے جواب نہ بن پڑا اور وہ نہ سمجھے کہ چہرے کی لینی کسے کہتے ہیں۔ تو حلال خوری نے کہا "جاکو کام واہی کو ساجے اور کرے سو ٹھینگا باجے"۔ دلی کی بولی دلی والے ہی بول سکتے ہیں اور جو اُن کی نقل کرتا ہے۔ وہ الگ پہچانا جاتا ہے۔

فراق دہلوی عرض کرتا ہے کہ سچ مچ اردو ایسی ہی ہے۔ جو حلال خوری کا بیان فیلن صاحب کا تو یہ قصہ سنا سنایا ہے۔ اب جو صاحب اُردو کو دلی لکھنؤ کی قید سے آزاد فرما چکے ہیں۔ وہ تشریف لائیں اور اسی نسخہ کو آزمائیں۔ اگر الزام نہ کھائیں۔ تو جو چور کا حال وہ میرا حال اور لاف وگزاف کے لینے کی صحیح نہیں۔

عاشقوں کی بات چیت

ہجر ہے آفت جان وصل بلائے دل ہے
آدمی کے لئے ہر طرح غرض مشکل ہے

پھول والوں کی سیر ہو چکی تھی۔ قطب صاحب کی لاٹ سے لے کر جھرنہ تک ساری مہرولی بڑی بھائیں بھائیں کر رہی تھی سنسان، آدم نہ آدم زاد، جھرنہ میں پانی بھرا تھا۔ اور جھرنہ کے کنارے ایک مور کھڑا ناچ رہا تھا۔

آم کے درخت پر ایک کوئل ایک پپیہا بیٹھا تھا۔

کوئل۔ اے بھائی مور! تم کیسے نڈر ہو، جھرنہ کے کونہ پر ایک آدمی بیٹھا ہے ایسا نہ ہو تمہارے دشمنوں کو ستائے۔

مور۔ تمہارا کہنا سچ ہے۔ آدمی بڑا استاد ہے۔ مگر یہ آدمی ہمارا تمہارا بیری نہیں ہے۔ یہ بیچارہ مرنے سے پہلے مر چکا ہے۔ اور اسے بیماری نے چرلیا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو، آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے۔ ناک پکڑے دم نکلتا ہے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔ تمہیں ہمیں کیا ستائے گا۔

کوئل۔ اچھا تو میں زمین پر اتر آؤں۔ مجھے آج تین دن پانی پئے ہو گئے جھرنہ میں سے چار بوندیں پی لوں گی۔

مور۔ بوا کوئل تم شوق سے نیچے اتر آؤ۔ پانی پیو، نہاؤ، دھوو، چونچال ہو جاؤ میں ذمہ لیتا ہوں۔ یہ کل سرا تمہیں کچھ نہ چھیڑے گا۔ مور کے کہنے سے کوئل زمین پر اتری اور اس کی دیکھا دیکھی پپیہا بھی جھرنے کے کنارہ آ بیٹھا۔ دونو جانور گرم مزاج ہیں۔ اس لئے دونوں کے دونوں جھرنہ میں خوب نہائے۔ دھوئے اور مگن ہوئے۔ کوئل نے کہا۔ بھائی مور ندی ناؤ سنجوگ ہے۔ ہم کہاں تم کہاں آج اتفاق کی بات کہ ہم تین بندے زمین پر اترے بیٹھے ہیں۔ یہ موقع پھر کبھی نہ ہوگا۔ ایک بات آپ سے پوچھنی چاہتی ہوں۔ بشرطیکہ آپ ٹھیک ٹھیک بتا دیں اور چھپائیں نہیں۔

مور۔ جو بات کہنے کے قابل ہوگی تو میں نہیں چھپاؤں گا اور کہہ دوں گا۔

کوئل۔ نہیں آپ کا یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ کہنے کی ہوگی تو کہہ دوں گا یہ قول دیجیے

کہ کہنے کی ہو یا نہ ہو۔ جو بات تم پوچھو گی، وہ بے دریغ کہہ دوں گا۔

مور۔ واہ بوا! یہ تو ہار نی ہرانی ہوئی۔ خیر تمہارا کہنا نیچے نہ ڈالوں گا۔ جو تم پوچھو گی بتا دوں گا۔

کویل۔ یہ آپ کے پروں میں جو سنہری پن اور نیلم پکھراج کا رنگ ہے کیونکر پیدا ہوا۔ اور یہ چمک دمک آپ کے سراپا میں کہاں سے آئی۔

مور۔ افسوس بہن کوئل تم نے غضب کیا۔ مجھ سے قول لے لیا۔ نہیں کہتا ہوں تو جھوٹا بنتا ہوں۔ کہتا ہوں تو فرہاد اور مجنون مجھے پیٹ کا ہلکا کہیں گے، یہ کہہ کر مور نے ایک آہ کی جس نے آس پاس کی پہاڑیوں کو لرزا دیا۔ مور کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کویل اور پپیہا۔ بھائی طاؤس شکوہ ہم دونوں بھی فرہاد اور مجنون کی مجلس کے بیٹھنے والے ہیں۔ جو ان کا رنگ ڈھنگ ہے۔ وہی ہمارا دین ایمان ہے۔ اگر آپ کچھ بھید کی بات ہمارے سامنے کہیں گے۔ تو ہم اپنے عزیزوں کے سامنے بھی نہ کہیں گے۔ محفل سے باہر بات نہ جائے گی۔

کوئل کی باتوں نے مور کے زخمی دل پر مرہم کا اثر دکھایا۔ اور اس نے اپنی بپتا اس طرح شروع کی۔ حسن آباد میں عالم افروز نام ایک نازنین تھی جس کی خوبصورتی اس درجہ کی تھی کہ چاند سورج اس کے ناخنوں میں پڑے چمکا کرتے تھے۔ اس کا بوٹا سا قد، اٹھتی جوانی، سر سے پاؤں تک نور ہی نور تھی۔ ریشمی لباس، پھولوں کا گہنا، ویسے تو طرح طرح کے زیور پہنتی تھی، مگر جھومر کا اور خاص کر جڑاؤ جھومر کا اُسے بڑا شوق تھا۔ اور جھومر اسے لگتا بھی ایسا بھلا تھا

کہ جو دیکھتا اپنا کلیجہ پکڑ کر رہ جاتا۔ عالم افروز نے مجھے بچہ سا پالا تھا۔ اور میرے ساتھ اُسے بڑی محبت تھی۔ مجھے وہ گود میں لے کر بیٹھتی تھی۔ پیار کرتی تھی، میری گردن پر ہاتھ پھیرتی تھی۔ جب میں اس کی گود میں بیٹھا ہوتا تھا، تو اس کے جھومر کے پر کالہ پر ٹھونگیں مارا کرتا تھا۔ اور وہ کہا کرتی تھی غارتی اتنا چربانک بن یاد رکھنا اگر کسی دن تری ٹھونگ سے میرا جھومر میرے ماتھے سے سرک گیا تو بتری کیا سارے حسن آباد کی خیر نہ ہوگی۔ عالم افروز کے اس کہنے سے مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ کہ جھومر سرک جانے سے حسن آباد کی اور میری خیر کیوں نہ ہوگی اس جھومر کے نیچے کیا بھید ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی میرے دل میں یہ چاؤ پیدا ہوا کہ اس کے ماتھے سے کسی طرح جھومر سرکانا چاہیے۔ اور اب میں اس فکر میں پڑ گیا کہ کسی دن داؤ لگے اور میں اس جھومر کا پر کالہ نازنین کے ماتھے سے سرکاؤں۔ اتفاق یہ ہوا کہ نازنین کہیں مہمان گئی تھی۔ اور ساری رات جاگی تھی۔ گھر آئی تو اپنے کمرے میں دن کے وقت ایسی پڑ کر سوئی کہ اُسے اپنے آپے کی سدھ نہ رہی میں سارے محل میں اہلا گہلا پھرا کرتا تھا۔ اور نازنین کا چاہیتا تھا۔ مجھے کون روک سکتا تھا۔ میں بیدھڑک کمرہ میں گیا میں نے دیکھا کہ نازنین چھپر کھٹ میں بے خبر پڑی سوتی ہے۔ اور چھپر کھٹ کے چاروں طرف لونڈیاں پڑی خراٹے لے رہی ہیں۔ میں چپکے سے چھپر کھٹ میں پہنچ گیا۔ اور میں نے چونچ میں پکڑ کر نازنین کے ماتھے پر سے جھومر کو سرکایا۔ جھومر سرکا تو میں نے دیکھا نازنین کے ماتھے پر لکھا ہے۔ اللہ نور السموات والارض اور نور کے نون کے نقطہ سے ایسی تجلی نکلی کہ وہ آنکھوں کے رستہ سے میرے تن بدن میں

سما گئی، اور تمام تن بدن میرا نورانی ہو گیا، مگر مجھے اس تجلی نے بیہوش کر دیا۔
اور جب مجھے افاقہ ہوا تو میں نے اپنے تئیں اس جہان کے جنگل میں دیکھا۔ اور اپنے
تمام پھولوں کو اس تجلی سے پُر نور اور رنگین میرے خیال میں جہاں میں تھا فردوس
بریں، اور وہ نازنین حور عین تھی۔ اب میں اس مقام اور اس نازنین کی جدائی میں
تڑپتا ہوں۔ اور نالہ و فریاد کرتا ہوں۔ بے عقل انسان کہتا ہے بھورا جھنگارتا ہے
مور خوش آواز ہے۔ اور میں شور و فغاں کرتا ہوں۔ اور قیامت تک اسی طرح
شور و فغاں کرتا رہوں گا۔ اور جدائی کی آگ میں جلتا رہوں گا۔ اب بہن کویل
تم بھی اپنی رام کہانی سناؤ۔ کیونکہ تمہارا رات دن کا چیخنا چلانا کہے دیتا ہے
کہ تم بھی ہجر کا صدمہ اٹھاتی ہو۔

کویل۔ بے شک میں اپنے یار کی جدائی میں بیکل رہتی ہوں۔ اسی کے دھیان
میں میرے کلیجہ سے ہوک اٹھتی ہے۔ میرا حال آپ کے حال سے ملتا جلتا ہے
آپ جس شہر کو حسن آباد کہتے ہیں۔ مجھے اس کا نام جمالستان بتایا گیا تھا۔ آپ جس
محبوب کو عالم افروز سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں اسے جہاں افروز کہتی ہوں، اور وہی
محل اور وہی سونے چاندی کی دیواریں، وہی باغ وہی چمن، وہی بہار وہی آبشار
وہی چہل پہل وہی خوشی، وہی راؤ چاؤ، مجھے جہاں افروز نے پال پوس کر بڑا
کیا۔ پرچھائیں کی طرح میں ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی۔ میری جان اس پر
جاتی تھی۔ مجھے اس کی زلف اس کی چوٹی بہت پسند تھی۔ اور وہ میرے اس
دیکھنے بھالنے کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے مجھے جتا دیا تھا۔ کہ میری چوٹی نہیں ہے
زہر اور قہر ہے۔ اگر تو نے اسے چھو لیا یا تو اس کے چھاؤں تلے آ گئی تو پھر تو

جل کر فنا ہو جائے گی۔ اور تیرا پتہ بھی نہ لگے گا۔ اُس کے کہنے کا الٹا اثر ہوا۔ میں اس دھن میں اُلجھ گئی۔ کہ کسی طرح اس کی چوٹی کو ٹٹولوں۔ اس کا قاعدہ تھا کہ وہ سنگار کے وقت سب پرستاروں کو کمرے کے باہر بھیج دیتی تھی۔ اور صرف مشاطہ اپنا کام کیا کرتی تھی۔ ایک دن وہ چمن میں بیٹھی چوٹی گندھوا رہی تھی۔ اور لونڈیاں پہرہ پر کھڑی تھیں، میں نا نصیب اوپر ہی اوپر اڑ کر وہاں پہنچی جہاں وہ سنگار کر رہی تھی۔ میں شمشاد کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ جہاں افروز کرسی پر بیٹھی ہے۔ اُس کے بال کھلے ہوئے ہیں۔ اور اتنے لمبے ہیں کہ ہزاروں کوس تک چلے گئے ہیں۔ اور سارے آسمان پر چھا گئے ہیں۔ جہاں زمین پر اُن بالوں کا سایہ پڑا ہے۔ سنبل۔ مشک۔ عنبر۔ اگر۔ تگر۔ تیز پات چھل چھبیلہ ناگر موتھہ۔ لونگ ہزاروں قسم کی خوشبو کی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یکایک اُس کے کھلے بالوں میں سے خوشبو کی لپٹ آئی۔ جو میرے حلق میں اتر گئی۔ اور اس کی گرمی نے میرے سراپا کو پھونک دیا۔ میں غش کھا کر شمشاد کے درخت سے نہر میں گری اور جس وقت مجھے ہوش ہوا۔ تو میں نے دیکھا نہ جمالستان ہے نہ قصر فردوس ہے۔ نہ بلکہ جہاں افروز ہے۔ نہ اس کی کاکل تیرہ و تار ہے۔ بساندی زمین پر میں پڑی ہوں۔ میری پروں کی سفیدی جیسے موتی اور برف کو مات کرتی تھی۔ آہ سیاہی میں اندھیری رات کو مات کرتی ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہزاروں برس سے یار کے فراق میں آہ و زاری کرتی ہوں مگر یاد عالم بالا پر اور میں مٹی کی زمین پر، وہاں تک میری آواز نہیں پہنچتی۔ چیخ چلا کر تھک جاتی ہوں جب دم گھٹانے ہوتا ہے تو پھر فریاد کرتی ہوں ؎

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل تو لکیر پیٹا کر

مسوری۔ واہ بہن کویل تمہارا کیا کہنا۔ سچے عاشقوں میں سے ہو۔ تمہاری تعریف سارے جہان کے پرندے کرتے ہیں۔ اب بھائی پپیہا آپ رہ گئے ہیں۔ مناسب ہے کہ آپ اپنی بپتا سُنا دیں۔ کہ آپ دن رات کیوں کراہتے ہیں۔ کسے چاہتے ہیں۔

پپیہا۔ بھلا میری مجال ہے۔ کہ میں آپ جیسے عاشقوں کے پیشوا کے سامنے اپنا حال دل سناؤں۔ میں بھی اُسی کافر شوخ ڈھنگ کا مارا ہوا ہوں۔ صرف ناموں کا فرق ہے۔ اُس شہر کا نام مجھے خوبستان اور نازنین کا نام نور افروز بتا یا گیا۔ وہی پائیں باغ اور وہی قصر و ایوان اور وہی سامان تھے۔ جن کا ذکر آپ صاحبوں نے کیا ہے۔ نازنین کے ہاتھوں پر بیٹھا رہتا تھا۔ جب وہ ہنستی تھی تو اُس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور میں کھا یا کرتا تھا۔ اور جب اُسے پسینہ آتا تھا تو اس کے پسینہ کی بوندیں سچے موتی ہو جاتے تھے۔ میں کیا کہوں ان موتیوں اور پھولوں میں کیا مزہ تھا۔ صبح اٹھ کر وہ نازنین دو چاند اور دو سورج اور دو درجن تارے کھایا کرتی تھی۔ ایک دن اس کے چمچہ سے تارہ کا ایک بھورہ میز پر گرا۔ اور وہ بھورا میں نے کھا لیا۔ اُس کا کھانا غضب ہو گیا۔ میں نے اِنّی اللہ بکنا شروع کیا اور اس قدر چیخا چلایا اور غل مچایا کہ سارے محل کو سر پر اٹھا لیا۔ وہ میرے دلاڑے سے تنگ ہو گئی تو اس نے شہبازکوتوال کو بلا کر حکم دیا کہ اس کم ظرف چڑیا کو خاکستان فنا میں پہنچا دو۔ یہ نالائق وہاں بڑا چیخا کرے گا۔ اور ہمارے کان

تک اس کی آواز نہ پہنچے گی۔ شہباز نے مجھے انڈے کے قالب میں بند کر کے اس جہان میں پھینک دیا جس وقت سے مجھے ہوش آیا۔ میری زبان تاتو کو نہیں لگی۔ میں برابر نالہ و فغاں کئے جاتا ہوں۔ برسات کے موسم میں نکالا گیا ہوں۔ اس لئے برکھا رُت آتی ہے تو مجھے وہ مقام زیادہ یاد آتا ہے اور میں بیقرار و بیتاب بن جاتا ہوں۔ اور شور و فریاد سے آسمان سر پر اُٹھا تا ہوں۔

ایک میری عرض یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں۔ یہ آدمی بھی ہماری طرح عشق کا مارا ہوا ہے۔ تو اس کے منہ سے اس کی داستان سنوا دیجئے۔ مور نے کہا ضرور۔ یہ کہہ کر مور انسان کے پاس آیا۔ اور یہ بات زبان پر لایا۔ مولانا آپ کی تحریر و تقریر سے انسان بہت کچھ فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اب ہم پرندوں کے اوپر بھی عنایت فرمائیے۔ اور چند کلمے عشق و حسن کے ہمیں بھی سنائیے مگر جگ بیتی باتوں کے ہم مشتاق نہیں۔ جو آپ پر گذری ہو۔ اس میں سے کچھ فرما دیجئے ؛

فراق۔ میاں مور! انسان وہی ہے۔ جسے عشق ہو، جو محبت کے پھندے میں پھنسا ہو۔ تم تینوں پرندے بشر سے بڑھ کر ہو۔ کیونکہ تم میں روحانی جوہر ہے۔ اور اسی جوہر کو تم میں چمکتا دمکتا دیکھ کر اپنی عشق کی داستان تھوڑی سی سناتا ہوں۔ یاد رکھو کہ میرا اور سارے عالم کا محبوب وہی ایک ہے جس پر تم سب دیوانے ہو۔ اور تم نے تین عدد اُسے سمجھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ جہاں تم تھے۔ میں ہر دم نازنین کے ساتھ تھا۔ میں تمہیں اور تمہارے حرکات و سکنات کو دیکھتا تھا۔ مگر تم مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ اشرف المخلوقات

نے مجھے چھپا رکھا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتی تھی۔ میں صرف دیکھنے دکھانے کے لئے
ہوں۔ ہاتھ لگانے کے لئے نہیں ہوں۔ اگر کسی دن تو نے بھول کر بھی میرے
ہنڈے کو چھو لیا۔ تو تیری جان کی خیر نہیں۔ اور میدان قیامت برپا ہو جائیگا۔
میری کمبختی رات کا وقت تھا۔ وہ اپنے چھپر کھٹ پر پڑی سو رہی تھی شمع کی
روشنی میں اس کے جوبن کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اور صل علیٰ کہہ رہا تھا۔
یکا یک سونے کی بدمستی میں اس کی کرتی ذرا اوپر کو ہو گئی۔ کرتی خود اونچی اور
تنگ۔ نیند کے مسکوڑے نے رہا سہا بیٹ کھول دیا۔ مجھ خاکی نژاد کو اس
کے دیکھنے کی تاب نہ ہوئی۔ میں نے گھبرا کر کرتی کو نیچے سرکانا چاہا۔ ہاتھ تو نہیں
لگا۔ مگر ناخن لگ گیا۔ اور آن کی آن میں ہم نے اپنے تئیں اس اندھیرے
جہان میں پایا۔ کف افسوس ملتا ہوں اور فراق یار میں روتا ہوں ٭

جن و پری

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

مولوی تسلی صاحب غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک بزرگ دہلی میں گزرے
ہیں۔ قوم کے سیّد تھے۔ چشتیہ نظامیہ طریقہ اچھی طرح حاصل کیا تھا۔ دوسرا
کمال ان کا شاعری تھا۔ حمد اور نعت اور منقبت کہتے تھے۔ اور ایسی خوب

کہتے تھے۔ جسے سن کر جاہل اور قابل عورت اور مرد، بڑے اور بچے وجد کرتے تھے۔ اور یہ قبولیت صرف شاہجہاں آباد اور اس کی فصیل کے اندر نہ تھی بلکہ تمام ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ ہرنی کا معجزہ اور بہت سی مناجاتیں جو بمبئی اور کلکتہ میں فقیر سڑکوں پر دوکان دوکان پڑھتے پھرتے ہیں۔ اس کا مقطع بتا دیتا ہے۔ اور تسلی تخلص جتا دیتا ہے۔ کہ یہ مولانا تسلّی صاحب دہلوی کا تبرک ہے۔
ان کے عہد میں قلعہ آباد تھا۔ حضرت ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی حمد و نعت میں بھی خوب شعر کہتے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق۔ حکیم مومن خاں صاحب مومن میرزا اسد اللہ خاں غالب شاعری کے استاد موجود تھے۔ دہلی اہل ہنر سے بھری پری کٹورہ کی طرح بڑی چھلک رہی تھی۔ مگر جب ان کی تصنیف کسی میلاد کی محفل یا محرم کی مجلس میں یا کہیں آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ تو یہ حضرات مودب ہو جاتے تھے۔ اور اشارہ سے کہتے تھے۔ خدا کے لئے چپ ہو جائیے۔ اور مولانا کی نظم سن لینے دیجئے۔ ایک بار کسی مجلس عزا میں مرثیہ خواں اور حدیث خواں لوگوں نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت خوب خوب بیان کی سننے والوں کو رقت بھی ہوئی۔ واہ واہ بھی بہت ہوئی مجلس کے خاتمہ پر ایک لڑکے نے جس کی بارہ برس کی عمر تھی۔ صفیں سے منہ نکال کر تسلّی صاحب کا یہ شعر پڑھا ؎

اب یہاں کہتا ہے جوش دل کہ لکھ ذکر حسینؓ
کربلا میں کیونکر آیا فاطمہ کا نور عین

شعر سنتے ہی محفل میں قیامت برپا ہو گئی ٹس مچ گئی۔ حاضرین چیخ اٹھے پھر مولانا مناجاتیں کسی کو یاد بھی نہ کرواتے تھے۔ اور اپنی نام و نمود بھی نہیں چاہتے

تھے۔ بلکہ نوجوان اور لڑکے جن کے گلے میں ذرا سا کھٹکا ہوتا تھا۔ جب بلائے مولانا
کی خدمت میں آتے تھے۔ اور آپ کا کلام سر اور آنکھوں پر رکھے جاتے تھے،
اور یاد کر کے لوگوں کو سناتے تھے، اور اپنے پڑھنے کی داد پاتے تھے۔ مولوی تسلی
میری خوشدامن صاحبہ کے بڑے چچا تھے۔ اور وہ انہیں بڑے ابا کہا کرتی تھیں۔
فرماتی تھیں۔ بڑے ابا نے اپنا بیاہ نہیں کیا۔ ساری عمر اکیلے پن میں کاٹی کپڑا سفید
پہنتے تھے۔ مگر ایک کالی کملی ضرور بغل میں رکھتے تھے۔ ساون کی اندھیری جھکی
ہوئی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مینہ پڑ رہا ہوتا تھا۔ بجلی چمکتی بادل گرجتا ہوتا
گھر میں بیٹھنے والوں کے دل کانپتے ہوتے تھے۔ اور یہ ایکا ایکی اپنے پلنگ پر
سے اٹھتے اور کہتے گھر والوں دروازے کی کنڈی اندر سے لگاؤ میں قطب
صاحب کو جاتا ہوں۔ گھر والے کہتے۔ بھلا حضرت یہ کون وقت قطب صاحب
جانے کا ہے۔ مینہ کہتا ہے آج برس کے پھر نہ برسوں گا۔ اندھیرا گھپ ہے۔
خواجہ صاحب کی درگاہ یہاں سے گیارہ میل ہے۔ سڑک پر پانی ہی پانی ہوگا
مگر یہ کس کی سنتے کملی سر پر ڈال یہ جا وہ جا۔ اور قطب صاحب کے آستانہ کو جا
سلام کرتے۔ خواجہ صاحب اور سلطان جی صاحب اور روشن چراغ دہلی کی درگاہ
کے صاحبزادہ ان کی خو بو سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ انہیں ولی اللہ جانتے
تھے۔ جب یہ بے وقت کسی درگاہ میں حاضر ہوتے تو وہاں کے صاحبزادے
ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اور انہیں آنکھوں پر بٹھاتے۔ کھانا کھلاتے پانی پلاتے،
سردی میں پہنچتے تو انگیٹھی میں آگ لا کر ان کے سامنے رکھتے۔

حضرت مولانا تسلی صاحب نے اپنی زندگانی انہیں ہیرے پھیر دل

ہیں اور خواجگان چشت پروازی قربان ہونے میں پوری کر دی۔ ایک بار محرم کے عشرہ کی رات کو شاہجہان آباد سے سرِ شام ہی حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کی طرف چل دیئے۔ مگر اس سڑک سے نہیں جو دلی دروازہ سے سلطان جی کی طرف گئی ہے۔ بلکہ ٹمیا کے غیر معمولی رستے سے جو شاہ عبد العزیز صاحب کی مہندیوں سے کھنڈروں اور ویرانوں میں سے اونچی نیچی ہوتی گئی ہے۔ یہ کبھی کھنڈروں کا ایسا حصہ تھا جس میں سے دن کے وقت گزرنا اگہ دوکہ کو دہلا دیتا تھا، اور اب کا کہنا ہی کیا ہے۔ یہ ویرانی نئی دلی میں داخل ہو کر دولہن بن گئی ہے۔ اور انجنیرنگ کے صیغہ کی مشاطہ نے اسے بنا سنوار کر گلستانِ ارم کا نمونہ کر دیا ہے۔ الغرض مولانا تسلی صاحب چلتے چلتے اگر حسین کی باؤلی تک پہنچ گئے۔ یہ باؤلی غدر سے لے کر اب تک اس بات میں بدنام ہے کہ یہاں جن اور پریاں رہتی ہیں۔ اور شہر کے رہنے والے ثقہ اور سچے لوگوں نے یہاں جن اور پریوں کے کرشمے دیکھے ہیں۔ وہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں۔ مگر میں نے انہیں کان دھر کر نہیں سُنا۔ اور اُن کا باور نہیں کیا۔ مگر مولانا تسلی صاحب کے ارشاد کو تسلیم کرنا ضرور ہے۔ کیونکہ ایسے باخدا لوگ جو کچھ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

:۰۰(۲)۰۰:

مولوی تسلی صاحب اگر سین کی باؤلی کے پاس پہنچے تو اپنے تئیں چاندنی چوک میں پایا۔ دوکانیں ہر قسم کی چیزوں اور سامانوں سے آراستہ تھیں آدمیوں کی ہجوم سے گہما گہمی چہل پہل ہو رہی تھی، سقہ پانی پلا رہے تھے، کٹورہ بجا رہے تھے آواز لگا رہے تھے۔ پیاسو سبیل ہے۔ حسین کے نام کی۔ مولانا ہکا بکا چلے جاتے

تھے۔ جو دو چوبداروں نے آگے بڑھ کر مولانا کو سلام کیا۔ اور ہاتھ باندھ کر کہا کہ حضور والا نے آپ کو یاد کیا ہے۔ اور فرمایا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی فاتحہ دیتے جایئے۔ مولوی صاحب نے کہا "کہاں"! چوبداروں نے کہا۔ دیکھئے یہ سامنے بادشاہی محلسرائے ہے۔ اس کے اندر تشریف لے چلئے۔ مولانا نے چوبداروں کے کہنے سے نظر اٹھائی۔ تو واقعی ایک دروازہ دکھائی دیا۔ جو شاہجہاں کے لال قلعہ کے دروازہ سے زیادہ اونچا اور عمدہ بنا ہوا تھا۔ مولانا نے چوبداروں سے کہا۔ میں فقیر آدمی ہوں۔ مجھے بادشاہوں کے ہاں آنے جانے سے کیا سروکار مگر امام حسین علیہ السلام کے نام پر میں قربان ہوں۔ جہاں لے چلو گے چلوں گا۔ چوبدار خوش ہو کے آگے ہو لئے۔ اور مولانا کو محلسرائے میں لے پہنچے۔ ڈیوڑھی طے کر کے جب محلسرائے میں پہنچے تو محلسرائے کی تیاری دیکھ کر حیران ہو گئے۔ صحن باغ۔ باغ کے چمن، اور اُن کی بہار، دلفریب تھی، پھولوں کی خوشبو نے دماغ معطر کر دیا صحن چبوترہ پر پہنچے تو دیکھا صدر دالان میں ہزار آدمی سے زیادہ چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اور سب سیاہ پوش ہیں۔ ایک شخص تاج پہنے بیچ دالان میں بیٹھا تھا۔ مولانا کو آتا دیکھ کر وہ اٹھا اور لب فرش آ کر اور مولانا کے ہاتھ کو بوسہ دیکر آپ کو لے گیا۔ اور آپ کو اپنے برابر سوزنی پر بٹھایا۔ اور نوکروں سے کہا مٹھائی جلد حاضر کرو۔ اور نوکروں نے سینکڑوں سینیاں اور کشتیاں مٹھائی کی جن پر تورہ پوش پڑے تھے لاکر رکھ دیں تاجدار نے کہا۔ مولانا شہدائے کربلا اور آل مصطفےٰ کی فاتحہ اس شیرینی پر دیدیجئے۔ اگرچہ فاتحہ درود ہم لوگ بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ مگر میرے ہاں کا دستور ہے کہ آج شب کو جو تبانہ ہوتی

ہے۔ اس پر آپ جیسے بزرگ انسان سے ہی فاتحہ پڑھواتے ہیں۔ مولوی تسلی صاحب نے کہا، کیا مضائقہ ہے، یہ کہہ کر فاتحہ کو ہاتھ اٹھائے۔ اور فاتحہ پڑھ کر ادر اپنی کملی سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بادشاہ بھی تعظیم کو کھڑا ہوگیا۔ اور کہنے لگا مولانا تبرک تو لیتے جائیے۔ اور ایک بڑی چاندنی یا سفید چادر میں دو من مٹھائی باندھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کی گئی۔ مولانا نے کہا نہ اس قدر تبرک کی ضرورت ہے۔ نہ میں گٹھڑ تبرک کا اٹھا کر لے جا سکوں گا۔ بادشاہ نے کہا یہ لڑکا لے جائیگا اور فوراً ہی ایک لڑکے نے جس کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی۔ وہ گٹھڑ بغل میں مارا اور مولانا کے آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے جب مولانا حضرت کے آستانہ کی سڑک پر پہنچے، تو چونکہ شب شہادت تھی، بستی کے تعزیئے گشت کے لئے اٹھے تھے مشعلیں ساتھ تھیں۔ تاشے بج رہے تھے۔ جو مولوی صاحب کے ساتھی لڑکے نے دو من کی گٹھڑی مولانا کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ بس مجھے یہیں تک کا حکم تھا۔ اب میں آگے نہ جاؤنگا۔ یہ اپنا تبرک سنبھالئے۔ یہ کہہ کر لڑکا غائب ہوگیا۔ مولانا اس بوجھ کو کیا تھام سکتے تھے۔ تعزیوں کے ساتھ صاحبزادوں کو دیکھ کر مولانا نے کہا دوڑو دوڑو نہیں تبرک کی بے ادبی ہوگی۔ صاحبزادے لوگ مولوی تسلی صاحب کی آواز پہچان کر بھاگے مولانا دو قدم پر تو تھے ہی جا پہنچے کہا خیر ہے۔

مولانا صاحب نے فرمایا ہاں خیر ہے آج جنوں کے پھندے میں جا پھنسے تھے یہ انہوں نے دیا ہے درگاہ شریف کے صاحبزادہ فرماتے تھے شیرینی بہت نفیس اور لطیف بنی ہوئی تھی۔ خدا مولانا کو جنت نصیب کرے۔ اب بھی آپکی نظم میں یہ اثر ہے کہ جس محفل میں پڑھی جاتی ہے سنکر مسرور ہوتے ہیں اور سناٹا چھا جاتا ہے۔ مولانا کا دیوان قلمی شہر میں موجود ہے +

بائیسویں رجب کے کونڈے

صحبت گل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی
آجکل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی

۱۷- فروری ۱۹۲۵ء منگل کے دن صبح کی نماز پڑھ کر میں اپنے جھونپڑے سے نکلا۔ اور میر تفضل حسین کی کھڑکی سے گزر کر ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کے گلشن یادگار میں پہنچا تھا۔ بنارس کی صبح تو واقعی دلکش ہوتی ہے۔ مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ ہماری دلی کی صبح اس سے کچھ کم نورانی۔ دلفریب۔ دلکش نہیں ہوتی۔ جب شاہدرہ کی طرف سے پوپھٹتی ہے۔ اور تڑکا ہونے لگتا ہے تو اس کا نور جمنا جی، لال قلعہ اور جامع مسجد کے اوپر ایسی آبداری پیدا کرتا ہے جس کا لطف آنکھوں سے دل اور دل سے روح میں شامل ہو جاتا ہے اور سیر کرنے والا تھوڑی دیر اس تصور میں ڈوب جاتا ہے کہ میں اس وقت جنت کی بہار دیکھ رہا ہوں۔ جب میں پھاٹک سے گزر کر یادگار میں داخل ہوا تو سامنے ایک چوڑی چکلی روش تھی۔ روش پر دو رویہ انگریزی ناریل کے درخت اپنے سر اٹھائے عالم تحیر میں کھڑے تھے۔ اور ان درختوں کے نیچے مربع، مثلث اٹھواں کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اور کیاریوں میں پھلواری لگی ہوئی تھی۔ دہنے بائیں ہرے ہرے گھانس کے تختے تھے مگر موسم کی سردی نے بہار و گلزار کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ پھول پتے۔ کلیاں غنچہ اول تو بہت

ہی کم اور خال خال تھیں۔ اور جو کچھ تھیں سردی کی شدت سے اُن کے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں بے رونقی چھا رہی تھی۔ مگر پھر بھی چمن تھا۔ بربینیا۔ فلوک بکسٹائن کے پھول اپنی زردی۔ سرخی اور رنگا رنگی اور اپنی شادابی میں بینظیر تھے۔ ان پھولوں کے بیچوں بیچ میں ایک زمین دوز نل کی ٹونٹی لگی ہوئی تھی جس میں سے موتی جیسا سفید پانی ابل ابل کر چمنستان کو ترائی پہنچا رہا تھا۔ اسے دیکھکر میرے دل نے کہا۔ یہ زمین دوز ٹونٹی سے پانی نہیں اُبلتا ہے بلکہ آج صبح صادق نے فرش زمین سے طلوع کیا ہے۔ میں نے چاہا کہ ان خوش رنگ پھولوں میں سے دو چار توڑ کر ایک گلدستہ لے جاؤں اور اپنے گھر لے جا کر اور گلدان میں رکھکر ان کے دیدار کا مزہ اُٹھاؤں۔ مگر سامنے ایک بورڈ پر انگریزی اور اردو میں نوٹس لکھا ہوا تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جو شخص اس باغ کے کسی گل یا ٹہنی پتہ کو توڑے گا یا نوچے کھسوٹے گا تو مستوجب سزا ہوگا۔ نوٹس پڑھکر مجھے ہنسی آئی۔ اور میں نے کہا۔ سبحان اللہ۔ ؏

ہر زمین کہ رسیدیم آسماں پیدا ست

ہم عاشقوں کی جان کھکیڑ میں جھیلنے کے لئے ہی بنائی گئی ہے۔ صبح صبح چمن کی سیر کے لئے آیئے اور خدانخواستہ بھولے سے بھی کسی پنکھڑی یا پھول کو ہاتھ لگائیے تو پکڑے جایئے۔ مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہوجئے سزا پایئے اور رات کو تخلیہ میں بیٹھکر کسی گلعذار سے دل بہلانا چاہیئے تو گھرکیاں کھایئے۔ جھڑکیاں سنیئے۔ دیکھیئے میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ ذرا پرے بیٹھیئے۔ آج میرا جی اچھا نہیں ہے۔ مجھے چکر آرہے ہیں میں نے کل جڑاؤ سونے کی بالیاں

کانوں میں ڈال لی تھیں۔ کان کم بخت سوج سوج کر گردہ ہو گئے ہیں۔ اوئی نوج پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ خدا کو مان کہیں ٹھیس نہ لگ جائے تمہارے بار بار دیکھنے سے میری نرگسی آنکھیں دکھنے آگئی ہیں۔ غرض ہمارے لئے بہارستان حسن کے سیب زنخدان، انار، غنچہ لب، گل رخسار، سنبل زلف اور اس کے سارے پھل پھولوں کو چھیڑنا ممنوع ہے۔ چار و ناچار دل مجروح کو بہلاتا ہوا یادگار کے دوسرے پھاٹک سے نکلا۔ اُجڑے ہوئے اور بے نشان خاص بازار کی سڑک لانگ کر پریڈ کے میدان کی طرف بڑھا تاکہ قطب شاہجہان آباد حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی قدس سرہٗ العزیز کے آستانہ کرامت نشان پر پہنچکر جبیں سائی کروں۔ جو ٹھنڈی سڑک پر سے کسی شخص نے کہا۔ آج رجب کی بائیسویں ہے اس صدا کو سُنکر میری نظروں میں مسلمانوں کی دولتمندی کا عہد پھر گیا۔ کونسا عہد جس میں اکبر ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ کے نام کے بادشاہ تھے۔ یہ سچا سچا اور صحیح صحیح ہمارے بزرگوں کا دیکھا ہوا نقشہ ہے کہ لال قلعہ میں حضرت بادشاہ اور بیگمات بادشاہزادوں، مرشد زادوں، سلاطین کے دولت خانوں میں فاتحہ اور نیاز اور ایصال ثواب کے لئے عید، بقر عید، شب برات رجب، محرم کے موقعہ پر اتنے لذیذ کھانے اور نعمتیں پکائی جاتی تھیں کہ اگر ان کی فہرست لکھی جائے تو ان کے ناموں سے ایک بڑی کتاب تیار ہو جائے۔ پھر وہ نعمتیں اور کھانے سینکڑوں من کی تعداد میں پکتے تھے اور طالب علم ملا۔ درویش، حاجتمند تلاش کئے جاتے تھے کہ یہ کھانے انہیں کھلائے جائیں مگر اس قسم کے لوگ ان تاریخوں میں گھس لگانے کو بھی نہیں ملتے تھے۔ کیونکہ

انہیں ایک ہی سرکار ایک ہی محل سے اتنی نعمت ملتی تھی کہ دوسری جگہ اگر سونے کا نوالہ انہیں کھلایا جاتا۔ تو وہ کھانے سے مجبور ہوتے تھے۔ الحد ہوس باقی ہوس اس دور میں طالب علم جہدو کی مسجدوں میں پڑے رہتے تھے۔ وہ اپنے حجرہ میں برتن کے نام کا مٹی کا پیالہ بھی نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ بادشاہ وزیر امیر کبیر جس کسی دولتمند کے گھر سے ان لوگوں کے لئے کھانا آتا تھا چینی اور تانبے کے قلعی دار رکابیاں، پیالے، اور قسم قسم کے ظروف خوانوں میں رکھے ہوئے آتے تھے، طالب علموں کے سامنے دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ انہیں کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کھانا کھا کر طالب علم دسترخوان پر سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے، جو لوگ لاتے تھے۔ وہ جھوٹے برتن اٹھا کر لے جاتے تھے خصوصاً اس بائیسویں رجب کو قلعہ معلیٰ میں بڑی دھوم ہوتی تھی۔ کیونکہ ایک تو اس تاریخ پر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی نیاز ہوتی تھی۔ دوسری ۲۷ رجب کو رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فاتحہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ یہ حضور کی معراج کی تاریخ اور مسلمانوں کی خوشی منانے کا دن ہے۔ بائیسویں کو کھیر پکا کر مٹی کے کونڈوں میں جمائی جاتی تھی۔ پھر وہ کھیر صرف دودھ چاولوں کی نہ ہوتی تھی۔ بلکہ پستہ بادام کی کھیر، قلاقند کی کھیر اور رنگا رنگ فیرنیاں اور کھیریں ہوتی تھیں۔ خوشبو میں بسی ہوئیں۔ سونے روپے کے ورقوں اور درقیوں سے آراستہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے والے پیٹ بھر کر کھا لیتے تھے، تو چلتے وقت ایک ایک کونڈا کھیر کا اچھوتا، اور ہر کونڈے کے ساتھ نقدی کی ایک پوڑیہ بھی دیجاتی تھی۔ قلعہ معلیٰ کے باہر اردو بازار میں بعض لوگ شوقین ان قلعہ سے واپس ہونیوالوں

کے انتظار میں کھڑے رہتے تھے۔ اوران سے پانچ پانچ آنہ کو ایک ایک کونڈہ
کھیر کا مول لے جاتے تھے۔ اور اپنے بال بچوں کو کھلاتے تھے۔ ہر کونڈہ میں کم سے
کم بارہ سیر کھیر ہوتی تھی۔ ایک بزرگ معتمد اور ثقہ بیان فرماتے ہیں کہ فلاں مسجد میں
ایک رات کو طالب علموں کے لئے ایک دیگ مطنجن کی آئی۔ چوبدار جو دیگ کے
ساتھ آیا تھا۔ اس نے طالب علموں سے کہا مطنجن لے لیجئے اور دیگ خالی
کر دیجئے۔ طالب علم سٹ ٹپائے کہ ہمارے پاس ہٹی کی ایک رکابی تو ہے نہیں
یہ ایک دیگ کا مطنجن کس چیز میں بھریں۔ آخر انہوں نے یہ ترکیب کی کہ مسجد
کے کنوئیں کے پاس چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ اُسے اور کنوئیں کی من کو دھو کر
پاک کیا۔ اور کنوئیں کی من پر چاروں طرف مطنجن بھر لیا۔ دیگ خالی کر کے حوالہ
کر دی۔ کنوئیں کی من سے حوض میں پانی جانے کے لئے ننھی سی موری بنی
ہوئی تھی۔ اس میں سے کھانے کا گھی گزر کر حوض میں بھر گیا۔ اور طالب علموں
کے اشارہ سے محلہ والے علاوہ مطنجن کے پتیلیاں اور دیگچے بھر بھر کر اپنے گھر لے
گئے۔ یہ تو دوسری بات ہے۔ کہ اس قسم کی نیازیں بدعت حسنہ ہیں یا بدعت
سئیہ۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ ان حیلہ بہانوں سے غریب غربا جیتے تھے
اور ان صورتوں سے خیر خیرات بہت کچھ ہو جاتی تھی۔ گر ذکرم جوانی دیر پیری
و ذکر امیری در فقیری دروغ مے نماید۔ جب مسلمانوں کے اقبال کا ورق
اُلٹ گیا۔ اور لال قلعہ اجڑ گیا۔ تو یہ سچی باتیں قصے کہانیوں میں گنی جانے لگیں۔
اور سچ پوچھئے تو ایک لال قلعہ ہی نہیں اُجڑا۔ بلکہ مسلمانوں کی بداقبالی نے
لال قلعہ جیسے بہت سے قلعہ اور قصر اور حصار اور ارک ویران کر دیئے ہیں۔

فیروز شاہ کا کوٹلہ ۔ پرانا قلعہ ۔ غیاث پور ۔ اندر پرست ۔ پرتھی راج کے محلات تغلق آباد ۔ یہ سب دلی کے شاہنشاہوں اور چکرورتی ۔ راجہ بابوؤں کے زرنگار قلعہ ہی تھے اور ان میں اس قدر جاہ وحشم اور طبل وعلم تھے جو سکندر اور افریدوں کی آنکھوں نے خواب میں بھی نہ دیکھے تھے ۔ مگر اس جہان کی بنا ایسے چار رکنوں سے ہے جو بالکل بودے ہیں ۔ اور اس کی ہستی میں خاک کا پلہ غالب اور خاک کا جو بھو جو پانی میں گھل کر ناپید ہو جائے ۔ جسے ہوا اڑا لے جائے ۔ پھر جن چیزوں کے مٹنے پر میں افسوس کر رہا ہوں ۔ یہ باقی کیونکر رہ سکتے تھے ۔ مگر اس سے زیادہ حسرت اور افسوس کا یہ مقام ہے کہ ہمارے اس تن بدن کے اندر بھی ایک لال قلعہ ہے ۔ جس کے اندر کبھی شاہجہاں تخت طاؤس پر بیٹھ کر دربار کیا کرتا تھا ۔ اور اس شاہجہاں کی حکومت اس ہستی کے چاردانگ ہند میں پھیلی ہوئی تھی ۔ مگر شاہجہاں کی غفلت نے اسے تخت سے اتار دیا ۔ وہ لال قلعہ اجڑ گیا ۔ اس میں نہ باغ حیات بخش رہا ۔ نہ مہتاب باغ ۔ نہ دیوان خاص نہ دیوان عام ۔ مورکھ کیا اب تک نہ سمجھا کہ تیرے تن بدن میں لال قلعہ کون سا تھا ۔ اور اس میں شاہجہاں کونسا حکومت کرتا تھا ۔ سمجھ لے کہ میری مراد تیرا دل ہے ۔ اور یاد الٰہی اس میں شاہجہاں ہے ۔ غفلت کی باغی فوج نے شاہجہاں کو معطل کر دیا ہے ۔ اگر تو ہمت سے کام لے تو تیرے دل کا اجڑا ہوا لال قلعہ پھر آباد ہو جائے ۔ اور اگلی سب بہاریں پیدا ہو جائیں ۔ میاں نظیر اکبرآبادی نے گویا اسی موقع کے لئے یہ شعر کہا تھا ؂

اللہ کو ہر دم یاد کر اس نام سے دل شاد کر
اجڑا وطن آباد کر جو عاقبت درکار ہے

اجڑا وطن تیرا دل ہے۔ اس کی آبادی اور چہل پہل خدا کی یاد سے تھی۔ تو نے خدا کا نام لینا چھوڑا وہ اُجڑ گیا۔ اگر عاقبت کی درستی مطلوب ہے تو یاد الٰہی کر۔ جس طرح کہ قرآن پاک میں آیا ہے۔ یا ایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیرا

نواب عاقل خاں پنجہزاری

نواب عاقل خاں صاحب مرحوم کی نسبت عوام الناس نے طرفہ بہتان باندھ رکھے ہیں۔ اور اگر ان سے پوچھئے کہ عاقل خاں اُن کا نام تھا یا خطاب اگر خطاب تھا تو اُن کا نام کیا تھا۔ تو بس یہ کہہ کر چپکے ہو جائیں گے کہ اورنگ زیب کے عہد میں گزرے ہیں۔ اور ہمیں کچھ حال معلوم نہیں۔ جب ان حضرات کی معلومات اتنی سی ہو تو ان کا کہنا بالکل فضول اور لغو سمجھا جائے گا۔ فقیر فراق ان کی مختصر سوانحعمری تواریخ سے لکھتا ہے:۔

تذکرہ مرات الخیال میں لکھا ہے کہ یہ خوانی کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے کھرے سید میر عسکری نام ہے۔ اور رازی تخلص ہے اورنگ زیب عالمگیر کی ولی عہدی سے اُن کے راز دار اور اُن کے مصاحب تھے۔ جملہ علوم و فنون میں انہیں دستگاہ تھی۔ اور اسی فضیلت کی وجہ سے انہیں اورنگ زیب نے پسند کر کے اپنی رفاقت میں لے لیا تھا۔ بظاہر وہ ایک امیر اور پنجہزاری منصب رکھتے تھے اور یہ رتبہ شاہنشاہ نے انہیں سمجھ کر دیا تھا۔ صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ حضور والا

کو مہم دکن پر گئے ہوئے بارہ سال ہوئے ہیں۔ مگر شاہجہاں آباد کی صوبہ داری انہیں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس بارہ سال کی مدت میں ان کے انتظام کی خوبی سے دہلی اور نواح دہلی میں کبھی کا کھٹکا بھی نہ ہوا۔ خاص و عام سب ان سے خوش ہیں۔ رعایا مگن ہے۔ اور اُن کا دم بھرتی ہے۔ شاعری میں یہ استاد زمانہ تھے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ "گویند اورنگ زیب در ایام شاہزادگی یکے از پرستاران خاص کہ از شیوہ دلبری و نغمہ سنجی بہ سمع مبارک مے رسانید رحلت نمودہ مفارقتش بر خاطر آں حضرت نہایت دشوار گردید" یعنی مؤلف تذکرہ لکھتے ہیں کہ شاہزادگی کے زمانہ میں اورنگ زیب کا میلان ایک پرستار کی طرف تھا۔ جو شیوہ دلبری کے علاوہ حضرت کو اپنے گانے سے بھی خوش کرتی تھی۔ قضائے آسمانی سے وہ فوت ہوگئی۔ اورنگ زیب کو اس کی جدائی کا بڑا صدمہ ہوا اس کی وفات کے دوسرے روز حضور والا شکار کو تشریف لے گئے اور نواب عاقل خاں کو بھی ہمرکاب کر لیا حضور والا جب آبادی سے کئی میل دور جنگل میں پہنچ گئے۔ اور ساتھی ادھر اُدھر ہوگئے۔ تو عاقل خاں نے تنہائی پاکر حضور والا کی خدمت میں دست بستہ عرض کی۔ کہ اس پریشانی اور رنج و ملال میں حضور والا نے شکار کی تکلیف کس حکمت سے گوارا کی۔ حضور والا نے اس سوال کے جواب میں یہ شعر پڑھا ؎

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست

در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کرد

عاقل خاں نے عرض کی بجا ارشاد ہوا اور یہ شعر پڑھا ؎

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

اس شعر کو سنکر حضور والا کا دل بھر آیا۔ اور آپ کو دیر تک رقت ہوتی رہی۔ جب جی ٹھیر گیا۔ تو پوچھا یہ کس کا شعر ہے۔ کہنے والے نے معاملہ باندھ دیا ہے۔ اور خوب کہا ہے۔ عاقل خاں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ جس شخص کا یہ شعر ہے اس کی یہ تاب و طاقت نہیں ہے کہ وہ اپنے تئیں حضور والا کے روبرو شاعر کہے۔ اور اپنا نام ظاہر کرے۔ حضور والا کو معلوم ہو گیا کہ یہ شعر انہیں کا ہے تو انہیں بہت داد دی۔ اور کئی بار پڑھوا کر سُنا۔ اور اُسے یاد کر لیا۔ اور اسی روز سے نظر التفات بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ پنجہزاری کا مرتبہ عنایت فرمایا۔ اور شاہجہاں آباد کا صوبہ دار بنایا۔ میں یہاں عاقل خاں صاحب کی ایک غزل نقل کرتا ہوں تاکہ آپ اُسے پڑھ کر معلوم فرمائیں کہ عاقل خاں کس رتبہ کے شاعر ہیں۔

غزل

ابتدا عشق و انتہا عشق است
در میان نیز خود نما عشق است

جز خدا ہیچ کس نمی داند
با خدا عشق با خدا عشق است

در رہ عشق راہ از عشق ست
راہ زن عشق و رہنما عشق است

گفتگو نیست عاشق و معشوق
ہمہ عشق ست عشق را عشق است

عقل گوید کہ دلربا حسن ست
حسن گوید کہ دلربا عشق است

مے نماید فثم وجہ اللہ
عشق بیجا و جا بجا عشق است

لیس فی الدار غیرا و دیار ہم درین ہم دران سر عشق ست
خون منصور بعد قتل نوشت زندہ و مردہ کار با عشق ست

رازی از راز عشق گوئے چونے
نغمہ پرواز این نوا عشق ست

اس غزل کے رنگ سے کھلتا ہے۔ کہ نواب صاحب صوفی صافی ہیں اور وحدت الوجود میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مگر تذکروں سے یہ نہیں کھلتا کہ کس کامل کے مرید تھے۔ اور کس سلسلہ میں۔ قرینہ کہتا ہے کہ خواجگان چشت اہل بہشت سے واسطہ رکھتے ہیں۔ میرے مکرم نواب خواجہ مصلح الدین خاں صاحب ہمدانی دہلوی نے مجھے اُن کی ایک تصنیف دکھائی جس کا نام نغمۃ الرازی ہے۔ یہ تصوف میں فارسی زبان کی ایک کتاب ہے جو عرفان اور ایقان سے لبریز ہے۔ انداز تحریر مولانا نخشبی کے سلک السلوک سے ملتا جلتا ہے۔ عبارت اور عبارت میں مضامین بہت دلکش اور دلپسند ہیں۔ ہر مضمون کی سرخی کو نغمہ نغمہ کرکے لکھتے ہیں۔ اور ہر نغمہ کو ذوق وشوق کے پردوں سے اور اسرار کے تاروں سے روح پرور کرتے ہیں جن کے پڑھنے سے وجد ہونے لگتا ہے۔ جو کتاب کی اصل عبارت مزہ دیتی ہے۔ اس کی لطافت ترجمہ میں باقی نہیں رہتی ہے۔ تاہم دوستوں کی ضیافت طبع کے لئے نغمات الرازی میں سے ایک ترجمہ پیش کرتا ہوں :۔

نغمہ وجدیہ

اے عاشق اہتزاز سماع لذت استماع سے ہے اور مسموع سے استماع ہے

یعنی جب مطرب عشق ساقی بنتا ہے۔ اور بادۂ بے رنگ و بو خم خانۂ معانی سے نکلتا ہے۔ اور مینائے حرف وصوت میں ڈالتا ہے۔ اور کانوں کے پیالہ سے دل میں پہنچاتا ہے۔ اور سننے والوں کو مست بناتا ہے۔ اور انہیں زمین آسمان جھنکاتا ہے۔ اور وجد میں لاتا ہے۔ یہ لوگ اگر امید قرب کی بشارت پاتے ہیں تو خوشی کے مارے ان کی پیشوائی کے لئے اپنے سے گزر جاتے ہیں اور اگر دوری کا اشارہ پاتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں۔ اور اگر وصال کا مژدہ سنتے ہیں۔ تو شراب ناب کی طرح جوش مارتے ہیں۔ اگر جدائی کا راگ ہے تو سوکھ جاتے ہیں۔ اور نے کی طرح نیستان کی یاد میں شور کرتے ہیں اور اگر بلاوہ کی خبر پاتے ہیں۔ تو مستوں کی طرح ہاتھوں ہاتھ جاتے ہیں۔ اگر نکال لینے کا حکم سنتے ہیں تو مخموروں کی طرح فرش زمین ہو جاتے ہیں۔ اگر قبض ہوتا ہے تو غنچہ سا ل خون جگر کھاتے ہیں۔ اور گریبان چاک کرتے ہیں۔ اور اگر بسط ہوتا ہے تو پھول کے رنگ میں کھل جاتے ہیں۔ اور اگر وعید کا ترانہ ہے تو دل کی آگ سے سلگ اٹھتے ہیں۔ اور جان دیدیتے ہیں اگر وعدہ ہے تو انتظار کرتے ہیں اور اپنے تئیں تسکین دیتے ہیں۔ اور شرارۂ محبت چونکہ عاشق کی دل کی بھٹی میں دبا رہتا ہے۔ اور قوال کی نغمہ سرائی سے وہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اضطراب اور حرکت شعلہ کی صفت لازمی ہے۔ سماع کی حالت میں تسکین محال ہے۔ اے صوفی جب سماع کی تاثیر سے تیرے ضمیر کی آگ بھڑک اٹھے اور نہ بجھے تو اس وقت تیرے لئے یہی علاج ہے کہ تجرید اور تفرید کے دونوں قدم تو زمین پر رکھے اور دل کو اندیشہ اور وسوسہ سے خلع نعلین کی طرح سے خالی کرلے۔ اور عرصۂ سماع میں

روح مجرد بن کر آئے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے۔ فاخلع نعلیک بالوادی مقدس طوی۔

دُنیا کا پرانا طلسم

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

انسان نے اس زمانہ میں اپنی حکمت اور سائنس کے ذریعہ ایسے ایسے مصالحہ اور سامان پیدا کئے ہیں کہ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگا۔ ہزاروں کوس کے پلہ پر سنٹ بھر میں اس کی آواز جانے لگی۔ مگر اپنے غرور اور گھمنڈ میں اس کے لئے یہ نامناسب ہے کہ دہریہ بن جائے یا اسے یہ خبط ہو جائے کہ میں نے خدا کے بھید اور اسرار پا لئے۔ انہیں بھی اور ہم صوفیوں کو بھی یہ دھیان رکھنا چاہئے۔ کہ ہر تنزل میں ترقی اور ہر ترقی میں تنزل موجود ہے۔ ناچیز انسان کیسا ہی حکیم اور فلاسفر ہو جائے مگر خدا کے اسرار کو تو وہ کب پا سکتا ہے۔ وہ اپنے بھائی بنی آدم کی کاریگری کی تہ کو بھی ابھی نہیں پہنچا ہے۔ جب سے اسٹیم اور ریلیں نکلیں دنیا کی ساری آبادیاں کیا شہر کیا گاؤں کیا جنگل کیا پہاڑ گھر آنگنائی ہو گئے۔ سیاح جو اگلے زمانے میں تبرک سمجھے جاتے تھے۔ اور جن کی توقیر بادشاہ

کرتے تھے۔ آج انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ ملک مصر اور اس کا دار الملک قاہرہ اب کسی طرف سے دور نہیں سمجھا جاتا ہے۔ قبتہ الہرمان کو یورپ اور ہندوستان اور جاپان کے سیاح دیکھ آئے اور دیکھتے رہتے ہیں۔ مگر آج کوئی عاقل، کوئی دانشمند ٹھیک کہہ سکتا ہے۔ کہ ان کے بنانے کی علت غائی یہی تھی۔ جو یورپ کے دانا اور ہشیار بتلاتے ہیں۔ ان میں سے جو لاشیں نکالی گئی ہیں۔ اُن کی نسبت جو رائے زنی کی گئی ہے۔ اُسے صحیح کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ جبکہ آج تک کسی علمی طاقت نے یہ نہ سمجھا یا کہ لاشوں پر اور اُن کے کفن پر کیا مصالحہ لگایا گیا ہے۔ اگر اس مصالحہ کے اجزاء معلوم ہو جاتے تو ہم بھی اُسے تیار کرتے اور اس سے بہت کام لیتے۔ ان قبوں کی نسبت گو اس زمانے میں بہت کچھ چھان بین کی گئی ہے۔ مگر مسلمان بھی جب کبھی زندہ قوم کہلانے کے مستحق تھے۔ تو ان کی تحقیق سے غافل نہیں رہے۔

محاضرات ابن راغب میں ان قبوں کے بہت سے عجیب و غریب حال لکھے ہیں۔ آثار البلاد میں ان قبوں کے انوکھے حالات مرقوم ہیں۔ ربیع الابرار میں صاحب کشاف نے بہت سی خامہ فرسائی کی ہے۔

صاحب بحر السعادت محمد بن محمد ابراہیم الملقب حاجی تاج الدین ہراس الگازرونی اپنی تصنیف میں فرماتے ہیں۔ قبتہ الہرمان کے معاملہ میں فن علم سیاح اور حکیم اور دانشمندوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اگر میں اسے بیان کروں تو موٹی ساری ایک کتاب تیار ہو جائے۔ یہ قبے جالینوس سے ڈھائی ہزار برس پہلے موجود تھے۔ جب حکیم جالینوس نے مصر میں آ کر ان قبوں کو دیکھا۔

تو اس کی عقل چکرا گئی۔ اور وہ اس حکمت ولیاقت پر ان کے راز کو نہ سمجھ سکا۔ مگر میں ان باتوں کو سند نہیں گردانتا۔ البتہ میرے اُستاد میرے شیخ بلکہ شیخ الاسلام اُستاد و مقتدائے اہل علم شرقاً و غرباً براً و بحراً شیخ مجد الملت والدین ابی طاہر محمد بن یعقوب الفیروز آبادی اعلی اللہ تعالیٰ شانہ نے جو اپنی زبان مبارک سے قبۃ الہرمان کے بارہ میں ارشاد کیا ہے اُسے میں نے تیمناً و تبرکاً یاد کر لیا ہے۔ اور یہاں اُسے بیان کرتا ہوں۔

حضرت مجد الدین فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مصر ایسی جگہ ہے۔ جسے خدا نے شہر سمجھا اور مصر کے لقب سے اُسے یاد فرمایا۔ ورنہ دنیا کے تمام شہروں کو خواہ وہ کیسے ہی بڑے ہوں۔ قریہ کہا ہے۔ مصر کسی زمانہ میں چالیس کوس لمبا اور چالیس کوس چوڑا آباد تھا۔ اور اس میں اَن گنت آدمی رہتے تھے۔ وکذالک مکنا لیوسف فی الارض سے خدا کی مراد مصر ہے۔ جب سے حضرت ادریس علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ ہمارے بعد دنیا میں ایک طوفان آنے والا ہے۔ اور وہ زمین کی ہر چیز کو برباد کر دے گا۔ تو آپ نے اپنی حکمت نبوت سے یہ قبے بنوائے اور ہر قبہ میں جو چیزیں آپ کو رکھنی منظور تھیں۔ رکھ کر اُن پر طلسمی قفل لگا دیئے۔ یہ قبے صورت میں گول اور اوپر سے نکیلے ہیں۔ ان کے قد اتنے لمبے ہیں کہ دیکھنے والا اپنی پگڑی تھام کر دیکھتا ہے۔ اور اُسے گمان ہوتا ہے کہ ان کی چوٹیاں ابر سے لگی ہوئی ہیں۔ ان میں کوئی دروازہ یا اندر جانے کے لئے رستہ نہیں ہے۔ مصر کے رہنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ان قبوں میں سونے چاندی اور جواہر کے خزانہ بھرے پڑے

ہیں۔ جس شخص کو گنج نامہ مل جاتا ہے۔ تو اس کی مدد سے بہت سا مال قبہ
کھول کر نکال لاتا ہے۔ چنانچہ اس خیال میں ہزاروں آدمی قبوں کے چوگرد
پھرا کرتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو اہل مصر اپنی اصطلاح میں طالب کہتے ہیں
جو عورت مرد کا ہل وجود اور نڈھور ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ساری زندگی اسی
خبط میں کاٹ دیتے ہیں۔ کہ آج ہمیں کوئی بیجک مل جائے گا۔ اور ہم قبہ میں
سے دولت نکال کر امیر کبیر بن جائیں گے۔ اور ساری عمر بے فکری سے
کٹے گی۔

خلیفہ ہارون الرشید عباسی جس وقت مصر میں پہنچا۔ تو قبوں کو دیکھ کر
اور ان کی بابت عجیب وغریب داستانیں سن کر حیران ہو گیا۔ اور اسے اشتیاق
ہوا کہ میں قبوں کے اندرونی اسرار سے واقف ہوں۔ اس نے مصر میں قیام
کر دیا۔ اور اس نے قاہرہ اور بغداد کے استاد کاریگروں کو اکٹھا کر کے ایک
قبہ کی نسبت حکم دیا۔ کہ اس میں اندر جانے کے لئے راستہ بناؤ۔ کاریگروں نے
پہلے معمولی لوہے کی چھینی ٹانکیوں سے کام لینا چاہا۔ مگر ان کے منہ پھر گئے
تو فولاد کے اوزار بنوائے گئے۔ مگر وہ بھی گر گئے۔ جھڑ گئے اور قبہ کا پتھر ٹوٹنا کیسا
اس پر خط بھی نہ پڑا۔ اور کاریگروں نے خلیفہ سے کہدیا۔ امیر المومنین یہ کام ہم
لوگوں سے نہیں ہو سکتا۔ خلیفہ نے اپنے مشیروں سے جن میں بڑے بڑے
عاقل اور حکیم تھے مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا فی الواقع یہ تدبیر ٹھیک نہیں
اترتی۔ ہماری رائے یہ ہے کہ آلات کے منہ پر ہیرا جڑا جائے اور کام لیا
جائے۔ چنانچہ اس حکمت نے اپنا اثر دکھایا۔ مگر کئی کروڑ کا الماس خرچ

ہوگیا۔ اور قبہ کے اندر اتنا سوراخ بن گیا کہ آدمی سکڑ سمٹ کر اندر چلا جائے اور سوراخ ہونے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبہ اندر سے خالی ہے۔ مگر اندھیرا بہت ہے۔ ڈر کے مارے اُس میں کوئی گھستا نہ تھا۔ خلیفہ کی دھمکی دینے سے دو ایک شخص اندر گئے۔ اور صحیح سلامت نکل کر انہوں نے جو کچھ قبہ میں دیکھا تھا۔ وہ بیان کیا۔ خلیفہ اُن کے بیان کو سن کر بیتاب ہو گیا۔ اور اُس نے خود اندر جانے کا ارادہ کیا۔ خیر خواہوں نے اُسے روکا۔ مگر وہ کب رُکنے والا تھا۔ سوراخ میں گھس گیا۔ اور اُس کے پیچھے کئی جان نثار بھی داخل ہو گئے۔ جب خلیفہ چند قدم آگے گیا۔ تو اس نے اپنے تئیں ایک ایسے مکان میں پایا۔ جس کے کمرے کی چھت نہ تھی۔ کمرہ سنگ مرمر کا تھا۔ اور اس میں دن نکل رہا تھا۔ مکان کے بیچ میں سنگ مرمر کی ایک خوبصورت قبر بنی ہوئی تھی۔ قبر کے تعویذ پر ہونے کی کشتی رکھی تھی۔ جس میں ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ قبر کے سرہانے جو دیوار تھی اس میں تین گز کی اونچائی پر پتھر کے اندر ابھری ہوئی گلکاری ہو رہی تھی۔ اور گلکاری کے حلقہ میں عورت کا ایک کلہ بنا ہوا تھا۔ کلہ حسن و جمال میں حور و پری کے چہرے کو مات دیتا تھا۔ رنگ رخسار کی تازگی، بھوؤں کے بالوں کی باریکی، آنکھوں کی دلفریبی ہونٹوں کی مسکراہٹ زلفوں کے پیچ و تاب یہ کہتے تھے کہ دیوار میں غرفہ ہے اور اس غرفہ میں سے کسی زندہ پری نے اپنا پیارا مکھڑا سیر کے لیے نکال رکھا ہے۔ مگر جب خلیفہ نے اپنے ہاتھ کی چھڑی سے اُسے ٹھوکا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اُس کلہ میں یہ اثر تھا کہ جو اُسے دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں سودائے عشق

پیدا ہو جاتا تھا۔ کہ میں اس تصویر کو کس طرح ہاتھ لگاؤں۔ خلیفہ یہ تماشہ دیکھ کر قبہ میں سے نکلا۔ تو ہیروں کی کشتی کو ساتھ لایا۔ اور ہیروں کو انکوانے کے لئے بھیجا تو جوہریوں نے ان کی قیمت اتنی ہی بتائی، جتنے کروڑ سوراخ کے بنانے میں خلیفہ کے خرچ ہوئے تھے۔

دوسرے دن اس کام کے مہتمم نے آکر خلیفہ کے حضور میں عرض کی کہ یا امیر المومنین یہ کام ابھی جاری رہے گا۔ خلیفہ نے کہا۔ مجھے ایک فضول کام کے پیچھے اپنے خزانے خالی کرنے منظور نہیں۔ آج سے یہ کام بند کیا جائے۔

حضرت مجد الدین موصوف فرماتے ہیں۔ ہم بھی مدت تک مصر میں رہے ہیں۔ ہرمان مصر کو اور خصوصاً اس قبہ کو دیکھا ہے جس میں وہ سوراخ ہے ہمارے ساتھ کئی دوست تھے۔ جب ہم پھنس کر بہ مشکل اس سوراخ سے گزر کر قبہ کے اندر پہنچے اور اس سنگ مرمر کے بے چھت کمرے میں داخل ہوئے۔ ہمیں حیرت تھی کہ قبہ سب طرف سے بند ہے۔ یہ دن یہاں کیونکر ہو رہا ہے۔ مگر یہ راز مطلق سمجھ میں نہ آیا۔ قبر کے دیکھنے سے بڑی عبرت ہوئی۔ سامنے نگاہ گئی تو وہ صورت پری جمال تقویٰ شکن کھل کھلا رہی تھی ہمارے رفیقوں میں سے ایک شخص نے اس صورت کو بہت غور سے دیکھا۔ اور جب وہ صورت اُسے زیادہ پیاری معلوم ہوئی تو لپک کر اس کے پاس گیا۔ اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے منع کیا کہ خبردار اسے نہ چھونا۔ مگر اس نادان نے نہ مانا۔ اور یہ کہہ کر اس کے کان کیسے اچھے ہیں۔

عورت کے کان میں انگلی ڈالی۔ عورت کے کان میں بظاہر سوراخ برائے نام تھا۔ مگر خدا جانے کیا بات تھی۔ جب ہمارے دوست نے انگلی اُس کے کان پر سے سرکائی تو دوسرے ہاتھ سے انگلی پکڑ کر کہنے لگا۔ میں مر گیا۔ اس عورت کے کان میں بچھو بیٹھا تھا۔ اُس نے مجھے کاٹ لیا۔ جلن کے مارے وہ تڑپتا تھا۔ ہم لوگ بہت دشواری سے اُسے گھر لے کر پہنچے۔ حکیموں کو لیجا کر دکھایا۔ حکیموں نے قسم قسم کی ٹھنڈی دوائیں کھلائیں اور لگائیں۔ تریاق بھی چٹائے مگر وہ نہ بچا۔ اور صبح ہوتے ہوتے ملک عدم کو سدھار گیا اور ہم اُسے اول منزل پہنچا کر آئے۔ تو چپ بیٹھے تھے۔ اس میں ہمارا ملنے والا نان بائی آگیا۔ جو شیراز کا رہنے والا تھا۔ اور ہمیں ہم وطن سمجھ کر بہت محبت کرتا تھا اُس نے یہ قصہ سُنا تو کہنے لگا۔ میں جنوں کے طلسموں کو بہت دنوں سے جانتا ہوں۔ انہیں کی بدولت میری جیتی جاگتی ایک آنکھ گئی۔ شیراز سے آکر میں نے یہاں قاہرہ میں کھانے کی دوکان کھولی۔ اور تھوڑے دن میں میرا کام خاصہ چل گیا۔ چار خچر میں نے مول لے لئے اور جنگل سے ایندھن خچروں پر نوکر لانے لگا۔ ایک روز میں اپنی دوکان پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو ایک مصری نے آکر مجھ سے کہا۔ آغا تمہارے پاس کے خچر ہیں۔ میں نے کہا چار۔ اُس نے کہا مجھے ضرورت تو بہت سے خچروں کی ہے۔ مگر خیر دو تین پھیرے کر لینا۔ مجھے فلانی جگہ سے کچھ سامان لانا ہے۔ فی پھیرہ اتنے دام کرایہ کے دوں گا خچر لے چلو۔ چونکہ کرایہ معقول تھا۔ میں راضی ہو گیا۔ مصری نے کہا۔ میں آج ہی دن کے تین بجے آؤں گا۔ اور خچروں کو اور تمہیں لے جاؤں گا۔ لو یہ سائی کے

پیسہ ہیں۔ بس صبح تک ہم سامان لے کر شہر کو پلٹ آئیں گے۔ میں نے سائی
لے لی۔ اور مصری چلا گیا۔ اور ٹھیک اسی وقت آیا۔ جس وقت کے لئے کہہ
گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سوت کا ایک مضبوط رسہ تھا۔ اور ایک توبرہ ایک
لوہے کا پھاوڑہ۔ میرے نوکر نے مجھ سے کہا۔ آپ دوکان پر رہئے میں خچر
لے جاؤں گا۔ مگر میں نے نوکر کا اعتبار نہ کیا۔ اور میں ہی خچر پہنچانے کے
لئے مستعد ہو گیا۔ جھٹ پٹ پالان خچروں پر رکھ کر خالی گونیں ان پر ڈالیں
مصری نے ایک گون میں توبرہ اور رسی اور پھاوڑہ رکھ دیا۔ ایک خچر پر میں اور
دوسرے پر مصری سوار ہوا۔ اور دو خچروں کو آگے آگے کر کے قاہرہ سے چل دیئے
مصری مجھے قبہ الہرمان کے نواح میں لے گیا۔

شام ہو چلی تھی۔ آفتاب زرد ہو کر مغرب کی طرف جھک رہا تھا چھوٹے
بڑے قبوں کی پرچھائیاں لمبی ہو کر دور تک چلی گئی تھیں۔ بہت سے قبوں کے
بیچ میں اپنے تئیں دیکھ کر مجھے ڈر معلوم ہونے لگا۔ اور میں نے غور سے دیکھا
کہ خچروں کے اوپر بھی ہیبت سی چھا گئی تھی۔ وہ زور زور سے سانس لیتے
تھے۔ اور بے چین ہو رہے تھے۔ جو ایک بہت بڑے قبے کے نیچے پہنچ کر
مصری نے کہا۔ خچر روک لو۔ میں نے خچروں سے کہا بس ہٹا بس اور چاروں
خچر فوراً ٹھہر گئے۔ قبہ کے نیچے ایک اندارا کنواں تھا جس کی من بہت ہی خوشنما
پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ مصری خچر پر سے اتر پڑا۔ اور میں بھی خچر پر سے
اتر آیا۔ مصری کنوئیں کی من پر جا بیٹھا۔ اور اس نے مجھ سے کہا۔ جو سامان
میں لایا ہوں۔ وہ گون میں سے نکال لاؤ۔ میں اپنے دل میں حیران تھا اور یہ

سوچتا تھا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ اس شخص نے جس اسباب کے لئے کرایہ پہ گئے تھے وہ تو یہاں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ خدا خیر کرے۔ جب میں وہ چیزیں کنوئیں پرسے کر پہنچا۔ تو میں نے دیکھا۔ کنواں بہت گہرا ہے۔ اور اُس کا سفید پانی پارہ کی طرح چمک رہا ہے۔ مصری نے اپنی جیب میں سے ایک تعویذ نکال کر کنوئیں کے اندر ڈال دیا۔ تعویذ کا کنوئیں کے اندر جانا۔ اور اس کے پانی کا سانپ کی طرح لہرا کر اوپر آنا۔ میں سمجھا کہ یہ پانی مجھے بھی ڈبو دے گا۔ بارے گھٹنوں تک پانی پہنچ کر کم ہونے لگا۔ اور کم ہوتے ہوتے کنوئیں کی تہ میں غائب ہو گیا۔ مصری کا چہرہ خوشی کے مارے لال ہو گیا۔ اور اس نے پھاوڑہ کنوئیں کے اندر پھینک دیا۔ اور سوت کی رسی میں توبرہ باندھ کر اور اس کا سرا میرے ہاتھ میں دے کر توبرہ میں اپنا ایک پاؤں رکھ کر بے دھڑک کنوئیں میں اُتر گیا۔ اور کنوئیں کے منہ میں سے کچھ چیز کھود کر توبرہ میں بھری اور مجھ سے کہا کھینچ لو۔ جب میں نے ڈول کی طرح توبرہ اوپر کھینچ لیا۔ تو میں نے دیکھا خالص سونے کا برادہ تھا۔ یہاں تک کہ خچروں کی چاروں گونیں سونے کے برادہ سے میں نے ٹھونس کر بھریں اور اُن کا منہ سی دیا۔ آخر میں مصری نے ایک توبرہ مچا مچ سونے کے برادہ کا بھر کر مجھے اور دیا۔ اور اندر سے چلا کر کہا۔ آغا یہ تمہارا حصہ ہے۔ اس بات کو سُنکر میری باچھیں کھل گئیں۔ اور خوشی کے مارے میرے بدن میں میرے کپڑے تنگ ہو گئے۔

جس طرح رسی کے سہارے سے مصری کنوئیں میں گیا تھا۔ اسی طرح

وہ اوپر چڑھ آیا۔ اور اس نے اپنی جیب سے دوسرا تعویذ نکال کر کنوئیں میں
ڈالا۔ تعویذ پڑتے ہی ایک چھناکے کی آواز کنوئیں میں سے آئی۔ اور کنواں
اگلی طرح پانی سے بھر گیا۔ اب ہم دونوں نے بڑی خوشی اور اطمینان سے
گونیں خچروں پر لادیں۔ میں نے اپنے حصہ کا سونا اپنی چادر کے پلہ میں باندھ
کر احتیاط سے اپنے خچر پر رکھ لیا۔ اور ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر چاروں
خچروں کو ہنکاتے ہوئے شہر کی طرف چل دیئے۔ رات ہو چکی تھی اور اندھیرے
گھپ میں کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خچر قدم تیز بڑھائے چلے جاتے تھے کیونکہ
دانہ کا وقت گزر لیا تھا۔ میں اپنے دل میں خوش ہو رہا تھا۔ کہ خدا نے مفت
میں اتنا مال دلوا دیا۔ اب میں یہ ذلیل پیشہ چھوڑ دوں گا۔ اور شیراز جاکر چین
سے زندگی بسر کروں گا۔ اس خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور آسمان کے تاروں
کو گھور رہا تھا۔ جو یکایک مصری نے کہا۔ آغا ہم تم بہت رات گئے مصر میں
پہنچیں گے۔ اور اس مال کے رکھنے میں گھنٹوں کی دیر لگے گی مناسب
ہے کہ کچھ کھانا کھالیں۔ میں نے کہا جناب عالی! اس جنگل میں کھانا کہاں سے
آیا۔ مصری نے کہا۔ نہیں نہیں، کھانا موجود ہے۔ میں احتیاطاً ساتھ لیتا آیا
تھا۔ تو ذرا اپنے خچر کو میرے پاس لے آؤ۔ جب میرا خچر اس کے خچر کے پاس
پہنچ گیا۔ تو مصری نے شیرمال کا چھوٹا سا ایک گردہ میرے حوالہ کیا
میں نے سلام کر کے لے لیا۔ اور ٹکڑا توڑ کر کھایا۔ تو معلوم ہوا کہ بہت نرم اور
مزہ دار ہے۔ میں نے ابھی دو چار ہی نوالے کھائے ہونگے جو میرا سر چکرایا
اور میں خچر پر سے زمین کی طرف جھکا۔ مگر مجھے زمین تک پہنچنے کی خبر نہیں

البتہ جب مجھے ہوش ہوا۔ تو میں نے دیکھا صبح کا وقت ہے۔ نہ خچر ہیں۔ نہ مصری ہے۔ اور میں ننگا دھڑنگا ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر پڑا ہوں اور مجھے مردہ سمجھ کر کوّے نے میری ایک آنکھ کھالی ہے۔ اور دوسری میں ٹھونگیں مار رہا ہے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور ننگا ہی شہر کی طرف چل دیا لوگ مجھے دیوانہ سمجھے۔ ہزار خرابی اور دقت کے ساتھ گھر پہنچا۔ کپڑے پہنے دو تین دن میں جا کر میرے ہوش وحواس ٹھکانے ہوئے اور میں سمجھا کہ اس چالاک نے مجھے شیرمال میں داروئے بیہوشی دی۔ اور مجھے جنگل میں ڈال کر اس لئے چل دیا کہ میں اس غیبی دولت کا حال کسی سے نہ کہہ سکوں۔ اس بات کو کئی برس گزر لئے ہیں۔ میں ہر وقت جستجو میں رہتا ہوں۔ مگر آج تک نہ وہ مصری ملا۔ نہ میرے خچر ہی کہیں دکھائی دیئے۔ دولت تو گئی بھاڑ چولھے میں کئی سو روپے کے خچر بھی گئے۔ اور ایک آنکھ بھی گئی۔ جب کبھی میرے دل کو وحشت ہوتی ہے۔ تو قبۃ الہرمان کو جاتا ہوں۔ مگر نہ وہ قبہ مجھے ملتا ہے نہ وہ اندرا ہی دکھائی دیتا ہے۔

اس کے بعد شیخ نے فرمایا۔ کہ ہم نے اس سے بھی زیادہ عجیب قصہ قبۃ الہرمان کے متعلق قاہرہ میں یہ سنا کہ اسلامی حکومت سے پہلے اس شہر میں دو بھائی رہتے تھے۔ جو بہت ہی مفلس اور محتاج تھے "تا بڑ توڑ ان پر فاقے ہوتے تھے۔ اور وہ بڑے سسکا کرتے تھے۔ ایک رات کو وہ فاقہ میں بیہوش ہو گئے۔ تو انہوں نے خواب میں دیکھا۔ ایک شخص بزرگ صورت کہتا ہے۔ قبۃ الہرمان میں فلاں نے مقام میں جانا۔ وہاں تمہیں ایک کاغذ ملے گا اُسے اٹھا لینا جو

اس پر لکھا ہوا ہو۔ تم دونوں عمل کرنا۔ خدا چاہے تو دونوں نہال ہو جاؤ گے۔ مگر
اتفاق اور میل جول سے رہنا۔ صبح اٹھ کر دونوں بھائیوں نے اپنا اپنا خواب
سنایا۔ اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ غیبی اشارہ ہے۔ ہرمان کو چل دیئے اور
خاص اُسی مقام پر جا کھڑے ہوئے۔ جس کا پتہ ہاتف نے خواب میں دیا تھا۔
اِدھر اُدھر دیکھا تو چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ زمین پر پڑا ہوا۔ ہوا سے ہل رہا ہے۔
دونوں بھائیوں نے جھٹ اُسے اٹھا لیا۔ اس میں لکھا تھا۔ اے طالبو! تم
جس قبہ کے نیچے کھڑے ہو۔ اس کے پچھم کی طرف سات قدم گن کر زمین کھودو
تمہیں وہاں سے دو چیزیں عجیب و غریب ملیں گی۔ اُن میں یہ یہ اعجاز ہوں
گے۔ تمہیں اُن سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ اور تم بڑے امیر ہو جاؤ گے۔ کاغذ کو
پڑھ کر ایک بھائی وہیں بیٹھ گیا۔ اور ایک بھائی شہر کو گیا۔ اور کدال پھاوڑہ
اور ایک ٹوکری لے آیا۔ سات قدم گن کر اس مقام کو کھودنا شروع کیا۔ دو گز
نیچے لوہے کا بہت بڑا صندوق دکھائی دیا۔ جس میں مضبوط قفل لگا ہوا تھا۔
خدا جانے کب سے صندوق زمین میں دفن تھا۔ مگر زنگ کا نام تک نہ تھا
انہوں نے قفل کو ہاتھ لگایا تو بے کنجی کے قفل کھل گیا۔ صندوق کے اندر ایک
چھوٹا صندوقچہ رکھا ہوا تھا۔ صندوقچہ میں قفل تھا۔ اور قفل کی کنجی صندوق کے
اندر رکھی تھی۔ کنجی سے قفل کھول کر صندوقچہ کا ڈھکنا اٹھایا تو دیکھا۔ اس میں
کسی دھات کا بنا ہوا ایک گلاس ہے۔ جس میں اندازاً آدھ سیر پانی آسکتا
تھا۔ اور سونے کی موٹی سی ایک ٹکیہ رکھی ہے۔ جس کا وزن بھی کوئی آدھ سیر
ہی ہو گا۔ ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر دونوں بھائی پھولے نہ سمائے

اور انہیں صندوقچہ میں سے نکال رومال میں باندھ لیا۔ صندوقچہ میں قفل لگاکر کنجی جہاں رکھی تھی۔ وہیں رکھ دی۔ صندوق کو بند کیا۔ اس کنڈہ میں قفل ڈالا ہی تھا۔ جو آپ ہی آپ قفل لگ گیا۔ صندوق کے اوپر مٹی ڈال کر جگہ برابر کر دی۔ اور بھاگا بھاگ شہر کو آئے۔ کاغذ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ تاکہ کسی اور کے ہاتھ نہ جائے۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ اس ٹکیہ کا تیا پانچہ بازار میں ہی کرتے چلو۔ چھوٹے نے کہا ٹھیک ہے۔ صراف کی دوکان پر پہنچکر ٹکیہ دکھائی۔ صراف نے کہا واہ وا یہ طلائے شدادی آپ کے ہاتھ کہاں سے لگا۔ ایسا سونا دکھائی بھی نہیں دیتا ہے۔ انھوں نے کہا ہمارے بزرگوں کے وقت سے ہمارے پاس چلا آتا ہے۔ ضرورت کے مارے بیچنے آئے ہیں۔ تمہیں لینا ہے تو لو نہیں کسی اور صراف کو دیدیں گے۔ صراف نے کہا نہیں جناب میں ڈیوڑھی قیمت دینے کو تیار ہوں۔ اور فوراً روپیہ حساب لگا کر ان کے حوالہ کئے اور ٹکیہ لے لی۔ دونوں بھائی خوش خوش گھر آئے۔ روپیہ کی تھیلی کھولی تو اس میں سونے کی ٹکیہ بھی نکلی۔ ایک بھائی نے دوسرے سے کہا تو نے یہ کیا غضب کیا کہ ٹکیہ صراف کی آنکھ بچا کر اٹھالی۔ اب صراف کوتوالی کے سپاہی لیکر آئے گا۔ اور ہمیں تمہیں پکڑوائے گا۔ دوسرے نے کہا آپ کیا کہتے ہیں۔ صراف نے سونے کی ٹکیہ بڑی احتیاط سے اپنے صندوقچہ میں رکھ لی تھی۔ نہ میں لایا نہ میں لا سکتا تھا۔ نہ میرے دل میں بے ایمانی کا خطرہ تھا۔ ہو نہ ہو ٹکیہ میں یہی جوہر معلوم ہوتا ہے کہ بازار میں بک کر پھر مالک کے پاس پلٹ کر

آتی ہے۔ لاؤ اسے پھر بیچ آؤں۔ اب کے اچھی طرح حال کھل جائے گا۔ یہ بات دوسرے بھائی کی سمجھ میں آگئی۔ پہلا روپیہ گھر رکھ کر سونے کی ٹکیہ دوسرے صراف کے ہاتھ بیچ کر اور روپیہ ہتھیلی میں رکھ کر جب گھر آئے تو معلوم ہوا کہ یہ ہتھیلی میں آگئی ہے۔ جب اس کا تجربہ انہیں کئی بار ہوگیا۔ تو وہ ٹکیہ کو بازار میں بہت کم پہنچاتے تھے۔ کہ مبادا یہ بھید کھل جائے۔ اور ہم پکڑے جائیں۔ اس گلاس کا یہ طلسم نکلا کہ دریائے نیل کا پانی اس میں بھرتے ہی انگوری شراب بن جاتی تھی۔ اور شراب بھی خالص تند تیز۔ ان دونوں بھائیوں نے دریائے نیل کے کنارہ پر موقع سے ایک بہت بڑی عمارت بنوائی۔ اور شراب فروشی کی دوکان کھول دی۔ اور ہر روز ہزاروں روپیہ کو دریائے نیل کا پانی بیچتے تھے۔ اور سب شراب فروشوں سے سستا بیچتے تھے۔ اور دوکان دار ان کے ہاتھوں سے برباد ہوگئے۔ ان کے دیوالے نکل گئے۔ انہوں نے چھان بین کی جب انہیں کوئی بھید نہیں کھلا۔ تو بادشاہ سے فریاد کی کہ عجب معاملہ ہے۔ ان دونوں بھائیوں کے یہاں نہ انگور آتے ہیں۔ نہ کھجوریں۔ نہ تاڑی نہ سیندھی نہ ان کے یہاں کوئی بھٹی ہے۔ نہ یہ شراب بناتے ہیں مگر تمام ملک مصر سے اچھی شراب سستی بیچتے ہیں۔ اور دنیا کو لوٹے کھاتے ہیں۔ تحقیق کی جائے۔ کہیں جادوگر تو نہیں ہیں۔

بادشاہ مصر کے کان میں پہلے بھی کچھ اڑتی سی خبر پہنچی تھی۔ شراب بیچنے والوں کی داویلا سے زیادہ خیال ہوا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ کہنے والے سچ کہتے ہیں۔ حکم ہوا دونوں بھائیوں کو حاضر کرو۔ دونوں بھائی

چاروناچار دربار میں آئے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ سچ سچ حال کہہ دو۔ نہیں تو تمہارے سر تن سے جدا کرا دوں گا۔ موت کے ڈر سے دونوں نے جو بھید تھا۔ کھول دیا۔ بادشاہ نے دونوں چیزیں منگوا کر ان کی آزمائش کی۔ اور بیان کے موافق ٹھیک پاکر دونوں کو اپنے جواہر کے صندوقچہ میں بند کر کے اور قفل لگا کر صندوقچہ خزانچی کے حوالہ کیا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی۔ اور دونوں بھائیوں سے کہا۔ تم ہمیں وہ قبہ چل کر بتاؤ۔ جس کے پاس وہ صندوق آہنی دفن ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس صندوق کے اندرون اور زیادہ کوئی انوکھی شے امانت ہو۔ اور ہمارے ہاتھ لگے۔

دونوں بھائی بادشاہ کو لے کر قبہ کے پاس پہنچے۔ مگر نہ وہ قبہ ملا۔ نہ اس جگہ کا پتہ لگا۔

بادشاہ نے واپس آکر اُن سے کہا۔ تم دونوں بھائیوں نے تکیہ اور گلاس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اب اسی پر قناعت کرو۔ یہ دونوں چیزیں تمہیں اب نہیں مل سکتیں۔

دونوں بھائی بادشاہ کی جان کو صبر کر کے گھر چلے آئے۔

ایک دن بادشاہ نے خزانہ میں سے جواہر کا صندوقچہ منگایا۔ پہلے اس کے قفل کی مہر توڑی پھر قفل کھول کر چاہا کہ تکیہ اور گلاس کو نکالے۔ مگر دونوں چیزیں اندر ہی اندر غائب تھیں۔ بادشاہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔

(ختم)

کمالاتِ خسروی

آفاق ہا گردیدہ ام عشقِ بُتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

سلف سے جتنے تذکرہ نویس گزرے ہیں۔ اُن حضرات نے حضرت امیر خسرو طوطی ہند قدس سرہ العزیز کے متعلق صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ آپ ہندی فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اور شاعری کی بعض صنعتوں کے موجد گزرے ہیں۔ کچھ فقیر بھی تھے۔ اور علم موسیقی کو بھی جانتے تھے۔ اپنی استعداد اور حوصلہ کے موافق حضرت کے کلام پر کچھ رائے بھی لکھ دی۔ اللہ اللہ، خیر صلاح۔ تذکرہ نویسی کا حق ادا کر دیا یہ کچھ نہ لکھا کہ آپ باطنی درجہ کیا رکھتے تھے۔ اور علم موسیقی میں کہاں تک دخل تھا۔ مگر یہ دونوں کام اُن کے بُوتہ کے نہ تھے۔ کیونکہ ع

کار درویشی ورائے فہم تست

تصوف کا انہیں مذاق بھی نہ تھا۔ اور علم موسیقی سے بھی نابلد۔ ان صاحبوں کے نزدیک تصوف اور موسیقی دونوں عبث۔ مگر انہیں خبر نہیں تھی کہ اگر حضرت امیر خسرو دہلوی ؒ تصوف اور موسیقی میں دستگاہ نہ رکھتے، تو وہ بھی معمولی شاعروں کی طرح گمنام ہو گئے ہوتے۔ اور قبر ڈھونڈھے سے بھی نہ ملتی۔ یہ تصوف ہی کی برکت ہے کہ چھ سو برس

سے آج تک آپ کا مزار زربفت اور اطلس کے غلاف سے جگمگایا کرتا ہے۔ پھولوں کی سیج تیار رہتی ہے۔ اگرسوز ہیں عود اور خوشبوئیں ہر وقت جلتی رہتی ہیں۔ اور آپ کی خانقاہ کی دہلیز کو خلجی، لودھی اور مغل تاجداروں نے سجدہ کیا ہے۔ اور ہمارے حضور عالی جاہ قیصر ہند اور اور تمام لارڈ اور وائسرائے اور گورنمنٹ انگلشیہ کے با اقبال جانشین ہماری آنکھوں دیکھتے آپ کے مزار کی زیارت کو شوق کے ساتھ درگاہ میں آئے ہیں۔ اور چونکہ آپ کو بقائے باللہ حاصل ہوگئی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ آپ کے آستانہ پر اہلِ حاجت کا تانتا قیامت تک لگا رہے گا۔

ابوالقاسم فردوسی۔ خدائے سخن گزرا ہے۔ عسجدی۔ فرخی۔ خاقانی انوری، خاک ایران سے کیسے لائق فائق شاعر پیدا ہوئے۔ مگر ان میں سے کسی کے مزار پر خاص و عام کے جھمگٹ ایسے رہتے ہیں۔ جیسے ہمارے امیر صاحب کے آستانہ پر تو مجھے بتاؤ۔ جس خوبی نے حضرت امیر کو اس رتبہ پر پہنچایا ہے۔ اسی سے تذکرہ نویسوں نے جی چرایا ہے۔ افسوس اس چمن کی ہوا بگڑ گئی۔ گل اور غنچہ، برگ اور شگوفہ خزان نوچ کھسوٹ کر لے گئی۔ اور کانٹے رہ گئے۔ سائنس یا نئی روشنی اجازت نہیں دیتی کہ امیر خسرو دہلوی کو سوائے شاعر کے ولی بھی کہا جائے۔ اور اگر کہا جائے تو پھر اپنے تئیں جنٹلمینوں کی نگاہ میں حقیر کرنا ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حضرت امیر خسروؒ ایک صوفی حق آگاہ تھے۔ اور

آپ کے کلام میں جو زندگی ہے۔ وہ تصوف کی وجہ سے ہے۔ دیکھئے
کس قدر کھلم کھلا کہتے ہیں ؎

مرا زاں آتشِ شوقے کہ دامن سوخت اے خسرو
محمد شمع محفل بود شب جائے کہ من بودم

حضور محبوب پاک جو رات بھر مشاہدہ حق میں جاگتے رہتے تو آپ
کی چشم نرگسیں نیند سے کڑوی ہو کر صبح کو کچھ اور عالم پیدا کر لیتی تھیں۔
اسی کی طرف آپ اشارہ کرتے ہیں ؎

تو شبینہ میمنائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد

حضور والا کے درجۂ قرب کے متعلق فرماتے ہیں ؎

گفتم کہ حوری یا پری گفتم کہ من شاہ تہاں
گفتم کہ خسرو ناتواں گفتا پرستارِ من ست

حضرت امیرؒ کے کلام قدسی نظام میں جو مکاشفات واردات
شہود۔ وحدت وجود۔ لطائف وغیرہ تصوف کے مقامات کے گنائے
اشارے ہیں۔ اگر میں ان کی شرح کروں تو عوارف المعارف اور احیاء
العلوم اور فتوحات کی طرح ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں ؎

من ولی ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہ سلطانیم

میرے ہاتھ میں بھی محبوب پاک کا دامن عطر بیز ہے۔ حضرت امیر خسروؒ

کی جو شان ہے اُسے میں خوب جانتا ہوں۔ علی ہذا تذکرہ نویسوں کے خیال میں موسیقی بھی ڈوم ڈھاڑیوں کے لئے ہے۔ کہیں بھلے آدمی بھی اس میں دخوف رکھتے ہوں گے۔ ہائے میری مری ہوئی دلی تجھے آج میں کیونکر زندہ کر کے اُن لوگوں کو دکھاؤں۔ جس میں شرافت اور امارت کے لئے موسیقی کا جاننا ایک تمغہ گنا جاتا تھا۔

سراج الدین ابو ظفر بادشاہ دہلی اس فن کو اچھی طرح جانتے تھے اور اہل ہنر سے اسے سیکھا تھا۔ جب کبھی آستانہ محبوبی میں حاضر ہوتے۔ تو مزار شریف کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کرتے۔ آپ کے باپ دادا کا ڈوم حاضر ہے۔ اور پھر تیمناً و تبرکاً اپنی تصنیف کی کوئی چیز بہت خوش الحانی کے ساتھ گاتے۔ کیونکہ جانتے تھے کہ حضرات چشت کو سماع دل و جان سے پسند ہے۔

میر ناصر احمد بین کار۔ قطب بخش۔ چنا کنچنی۔ ٹڑموئی خانم کنچنی۔ دلدارا عظیمہ نٹنی۔ یہ حضور کے بزم کے ارباب نشاط تھے۔ جب یہ لوگ گاتے تو حضور ان کو موقع موقع سے داد دیتے تھے۔ اور اگر بے سر کی غلطی ہو جاتی تھی تو فوراً ٹوک دیتے تھے۔

واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ نے جس درجہ تک اسے حاصل کیا تھا۔ وہ سب جانتے ہیں۔

حضرت امیر ابن امیر نواب مستطاب حضور کلب علی خاں نور اللہ مرقدہٗ، اس فن کے جوہری تھے۔ جب آپ کے سامنے قطب الدولہ گویا

گا تا تھا۔ تو اس کا دل اندر سے ہلا کرتا تھا۔ کہ حضور اس فن کے بڑے سمجھنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہیں غلطی ہو جائے ؂

ہمارا گھرانہ خواجہ میر درد رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر خواجہ ناصر امیر مرحوم تک اس فن کا ماہر گنا جاتا تھا۔ ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں۔ جن میں تمام شہر کے قوال اور گویے اور کنچنیاں بے بلائے حاضر ہوتیں۔ اور رات بھر گا بجا کر اپنا اپنا ہنر دکھاتی تھیں۔ اس پیشہ کے جو کبھی باہر سے دلی میں آتے تھے۔ ان کی قوم کے لوگ اُن سے کہہ دیتے تھے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ہنر کی ساری دلی میں دھوم ہو جائے۔ تو خواجہ میر دردؒ کی بارہ دری میں جاکر سجادہ نشین کو کچھ سُنا آؤ۔ آپ جس پیشہ ور کی تعریف کر دیتے ہیں وہ شہر بھر میں پُج جاتا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اس تقوے اور طہارت پر ہندی موسیقی کے ارتھ وِدیا کو ایسا جانتے تھے کہ جب گویوں میں اس بات کا جھگڑا ہوتا تھا کہ یہ راگ سنپورن ہے یا سنکیرن۔ کھاڑو ہے یا اوڑو۔ تو شاہ صاحب کی خدمت میں آکر عرض کرتے تھے کہ ہمارا فیصلہ کر دیجئے۔ شاہ صاحب اس تشریح کے ساتھ انہیں سمجھاتے تھے کہ وہ آپ کے قدم پکڑ لیتے تھے۔ اور آپ کے فیصلہ کو دل و جان سے مان لیتے تھے۔

فن موسیقی درحقیقت حکمت میں شامل ہے۔ اس کے موجد حکمار گزرے ہیں۔ جنہوں نے سرگم یا سپتک کا مزاج الگ بتایا ہے۔

پھر راگ راگنی کی ترکیب سے بحث کی ہے۔ اور اس کی نسبت نجومی بھی مفصل لکھی ہے۔ اس کے اعمال، خواص، تاثیرات کو بیان کرکے بتایا ہے۔ کہ یہ راگ راگنی اس مرض میں فائدہ دیتی ہے۔ اس کے سننے سے فلاں بیماری جاتی ہے۔ اور ہندوؤں کے اعتقاد میں تو راگ الہامی فن ہے۔ اس کا تذکرہ وید میں موجود ہے۔ اور سینکڑوں گرنتھ اور پستکیں اور پوتھیاں سنسکرت میں اس کی تصنیف ہوئی ہیں۔ برہما جی۔ مہادیو جی۔ سری کرشن جی۔ ہنومان جی۔ دیوتا اور اوتاروں نے اسے مرتب کیا ہے۔ اور داخل عبادت فرمایا ہے۔

ہر راگ اور راگنی ایک روحانیت رکھتی ہے۔ جس کی ایک باطنی صورت ہوتی ہے۔ جب کوئی گائن بہت ادب اور عقیدت اور صحت کے ساتھ گاتا ہے تو راگ یا راگنی اپنی روحانیت یا حسن نورانی کو گائن کے اوپر ظاہر کردیتی ہے۔ اور بالمشافہ پرگھٹ ہوجاتی ہے۔ اگر گائن کم ظرف اور دل کا بودا ہوتا ہے۔ تو اس کے روپ سروپ کو دیکھ کر دیوانہ ہوجاتا ہے۔ ہندو مت کے عقیدت مندوں نے اپنے معبودوں کو الاپ چاری اور گلے سے گاکر بھی خوش کیا۔ اور ان کے رجھانے کے لئے ساز بھی ایجاد کئے سارنگی اور بین ایسے باجے ہیں۔ جو گلے کی باریک حرکتوں کو ادا کردیتے ہیں۔ اور اسی باعث سے دنیا کے سارے سازوں پر جاننے والوں کے نزدیک ان سازوں کو فوقیت اور ترجیح ہے۔

تال اور لَے کے تولنے کے لئے پکھاوج ایسا آلہ بنایا کہ بال بھر

کی زیادتی کمی معلوم ہوجاتی ہے۔ اگر یہ فن ایسا عجیب و غریب نہ ہوتا تو حضرت امیر اسے حاصل نہ فرماتے۔ درحقیقت آپ ایران کے فن موسیقی اور ہندوستانی سنگیت ودیا میں فرد کامل تھے۔ اسی باعث سے آپ کو اس فن کے اہل کمال نے نائکوں میں شمار کیا ہے۔ آپ اپنے وقت اور زمانہ کے نائک تھے نائک شاستر میں سنگیت ودیا کے کامل الفن اور موجد کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں اس کی مثال میں مجدد یا امام کا لفظ ہے۔ اور اس کامل کے باعث سے نائک کو جوتی سروپ بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے مہادیو جی پون کمار یعنی ہنومان جی۔ سری کرشن جی مہاراج وغیرہ جو لوگ اس فن کے عالم اور عامل ہیں وہ میری اس تحریر سے سمجھ جائیں گے کہ حضرت امیر خسرو دہلی کا اس ہنر میں کیا پایا ہے۔ بے شک آپ علم موسیقی کے حکیم اور نائک تھے۔ اور آپ کو اور نائکوں پر بھی فضیلت ہے۔ کیونکہ ہندو مت کے نائک صرف ہندوستانی راگ کو جانتے تھے۔ اور آپ ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں کی سنگیت ودیا کے استاذ الاستاذ تھے جس طرح آپ نے ہندی، فارسی اور ساری کے ساتھ ترکی عربی الفاظ کو کھچڑی بنا کر اردو کی بنیاد ڈالی تھی۔ اسی طرح آپ نے ہندی تال ادھیا اور سر ادھیا میں تصرف کیا۔ دیکھئے خمسہ کی تال آپ نے کس طرح بنائی۔ اس میں پانچ ضربیں برابر ہیں۔ دھن دھن دھا دھا۔ دن دن تا تت۔ دھا کٹ تک دھنک۔ دھنا کٹ تک دھنک۔ دوسرا ٹھیکہ آپ نے چھ تالوں سے قائم کیا۔ اور اس کا نام آپ نے فرودست رکھا۔ اس کے بول یہ ہیں:۔

دھین گڑتگ۔ دھین گڑتگ۔ تھگن تھگن دھن۔ گڑتگ
ڈینا گھٹنا۔

اس کے علاوہ بھی حضرت امیر نے بہت سی تالیں ایجاد کی ہیں۔ اس مختصر میں وہ سب نہیں آسکتیں۔ غالباً ناظرین انہیں دو تالوں کے بول پڑھ کر گھبرا جائیں گے۔ میں نے دو تالوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ میں نے یہ تفصیل بھی نہیں لکھی ہے کہ یہ دونوں کس موقعہ پر کام دیتی ہیں۔ اور گانے کی کون کون سی چیزوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بھی تفاوت نہیں جتایا کہ اگلی تالوں کی نسبت یہ کس قدر پُرلطف ہیں۔ اور انہوں نے قبولیت پائی ہے۔ جنہیں کچھ مذاق ہے وہ سمجھ جائیں گے۔ اور حضرت امیر کے کلام پر کمال تحسین کریں گے۔ اسی طرح آپ نے راگ راگنیاں بھی متعدد ایجاد کیں۔ مثلاً

(۱) نمازہ۔ یہ راگنی یا دھن آپ نے فارسی مقامات سے نکالی اور ایسی دلکش نکالی کہ ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک مقبول ہو گئی۔ اور سب استادوں نے اسے پسند کر لیا۔ یہ سنپورن ہے اور اس میں سوائے مدھم کے سب سُر تیور لگتے ہیں ✤

(۲) زلیف۔ اس راگ یا دھن کے موجد بھی ہمارے امیر صاحب ہیں۔ اسے آپ نے کھٹ راگنی سے رنگ دیا ہے۔ اس میں شرج پنچم سدھ ہے۔ رکھب مدھم دہیوت کومل گاندھار نکھشاد تیور ہیں۔ یہ راگنی رات کے آخر حصہ میں بہت مزہ دیتی ہے ✤

(۳) ضلع۔ اس کے موجد بھی آپ ہی ہیں۔ اور آپ نے اسے کافی اور سدھ سے ملاکر ایسا جاں پرور بنا دیا ہے۔ کہ سبحان اللہ۔ یہ بھی سنپورن ہے۔ جس میں شرج اور پنچم سدھ رکھب اور دہائیوت تیور ہیں۔ اور گاندھار، مدھم، نکھاد، کومل ہیں۔

(۴) سرپردہ اس کے موجد بھی آپ ہی ہیں۔ یہ راگنی بھی سنپورن ہے آپ نے اسے گور سارنگ، بلاول اور پوریا سے مرکب کیا ہے۔

اسی طرح آپ بہت سے راگوں کے موجد ہیں۔ اور ان کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر بن جائے۔ آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کا اقبال اساڑھ اور ساون کی گھٹا کی طرح اٹھا چلا آتا تھا۔ افغانستان۔ ایران ہندوستان ایک ہو رہے تھے۔ اور ان ملکوں کے اہل کمال دلّی چلے آتے تھے۔ ولایتی خنیاگر اور مطربوں کو اپنے نغمہ و سرود پر بڑا ناز تھا۔ مگر حضرت امیر نے اُن سے کہا کہ ہمارے ہندوستان کا علم موسیقی تمہارے ولایت کے موسیقی سے کچھ کم نہیں ہے۔ صرف نام اور ترکیب کا فرق ہے۔ ورنہ جو چیز تمہارے ہاں ہے۔ اُس سے اچھی ہمارے ہاں موجود ہے۔ پھر آپ نے اُنہیں گا کر سمجھایا کہ دیکھو جن کا نام تمہاری اصطلاح میں رکت اور غزل ہے۔ اس کا نام ہم نے کھٹ رکھا ہے۔ جسے تم بہات کہتے ہو۔ اُسے ہم دھناسری کہتے ہیں جسے تم صغیر کبیر کہتے ہو۔ اُسے ہم المن کہتے ہیں۔ جسے تم عشاق عراق اوج کہتے ہو۔ ہم اُسے گنکلی کہتے ہیں۔ جسے تم حسینی دوگا تو۔ اور عجم کہتے ہو۔ ہم

اُسے ساز نگ اور کافی کہتے ہیں۔ جسے تم سہ گاہ چہار گاہ یا پہ لبتہ نگارہ زنگولہ مغلوب کہتے ہو۔ ہم اسے ٹوڑی کہتے ہیں۔ جسے تم مجیرسی یا عراق کہتے ہو۔ ہم اُسے نمازہ کہتے ہیں۔ جسے تم عشاق کہتے ہو۔ ہم اسے سازنگ اور نسبت کہتے ہیں۔ جسے تم فرغنہ کہتے ہو۔ اُسے ہم گورا اور گنکلی کہتے ہیں۔ میں نے ایرانی اور ہندی راگوں کی ترکیب بھی مختصر دکھا دی ہے۔ جو حضرت امیر نے ایران کے استادوں کو سمجھائی ہے۔ ورنہ بہت سے راگ راگنیاں ہیں۔ جن کی حضرت امیر نے ایران اور ہندوستان کے راگ راگنیوں سے تطبیق کی ہے۔ پھر آپ نے گنٹھ (حلق) سے ادا کر کے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ جسے تم نشید کہتے ہو۔ ہندی والے اُسے الاپ کہتے ہیں۔ جس کا نام تم نے مدر رکھا ہے۔ اُسے ہمارے ملک میں ٹیپ کہتے ہیں۔ جسے تم لوگ ہشد کہتے ہو۔ اُسے یہاں والے شرج یا کھرج کہتے ہیں۔ جس کا نام تمہارے ہاں زمزمہ ہے۔ ہم اُسے گٹکری کہتے ہیں۔

آپ کے عہد میں ایک گویا گوپال نامی دکن سے دہلی آیا۔ اور کمال کے باعث سے دربار شاہی تک پہنچا۔ ایسا گایا، ایسا گایا کہ بادشاہ اور تمام حاضرین حیران ہو گئے۔ بادشاہ نے اپنے گویوں کی طرف اشارہ کیا کہ تم بھی گاؤ۔ اور اس کے کمال کا جواب دو۔ مگر سب نے کانوں پر ہاتھ دھر کر کہا اس انداز کا گانا ہم لوگ نہیں جانتے۔ بادشاہ کو بدمزہ دیکھ کر حضرت امیر نے کہا۔ اگر اجازت ہو تو میں

کچھ عرض کروں۔ بادشاہ نے کہا ضرور۔ آپ نے گوپال کے گانے کی ترکیب فوراً ہی اُڑالی۔ اور اُسی ڈھنگ میں اپنی طبیعت سے ترانہ اور قلیانہ ایجاد کر کے سُنایا۔ تو گوپال کے ہوش اُڑ گئے۔

حضرت امیر نے کہا۔ اُستاد جی! ان دونوں چیزوں کا نام بتایئے کیا ہے۔ گوپال بڑا ہنر شناس تھا۔ اُس نے کہا کبھی پہلے اس قسم کی چیز سنی ہو تو بتاؤں۔ نہ یہ دھرپد ہے۔ نہ چترنگ ہے۔ نہ ٹروت ہے یہ تو دنیا سے نرالی چیزیں ہیں۔ آپ کے حلق میں طوطی بیٹھا ہے۔ وہ نورانی بولی بول رہا ہے۔ آپ ہی بتایئے ان کا کیا نام ہے۔

حضرت امیر نے فرمایا۔ ایک کا نام ترانہ ہے۔ اور دوسرے کا نام قلیانہ۔ ان کا مرتب کرنا۔ اور گانا۔ اور تال سم کا جاننا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

جب آپ کا کمال گوپال کو پورا پورا معلوم ہو گیا۔ تو اُس نے آپ کے سامنے کان پکڑ کر کہا۔ آپ کو نائک کا لقب جچتا ہے۔ یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ کہ گھڑی بھر میں ایجاد بھی کریں۔ اور اسے ادا بھی کر کے دکھائیں بادشاہ بھی بہت خوش ہوا۔

آپ کے یہ کمالات تو سبھی سب تسلیم ہیں۔ مگر کوئی یہ تو ٹھیک ٹھیک بتائے کہ حضرت امیر خسروؒ کے وقت میں ہندوستان کے اندر کونسی یونیورسٹی تھی جس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی۔ سنسکرت۔ بھاشا اور تمام علوم اور فن موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس میں حضرت امیر نے تعلیم پاکر یہ

کمال حاصل کیا تھا۔ اس کا جواب چاروں طرف سے یہی ملے گا کہ اس وقت ایسا کوئی مدرسہ یا کالج نہیں تھا تو میں ضرور کہوں گا۔ اور سب اہلِ عقیدت اتفاق کے ساتھ یہی کہتے آئے ہیں۔ کہ حضرت امیر میں جو اس قدر ہنر گستری تھی۔ یہ حضرت محبوب پاک رضی اللہ عنہ کا فیضان تھا ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد
فی الحال بصورت طلا شد

نئی روشنی کے دلدادہ اسے نہیں مانیں گے۔ کیونکہ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ۔

مگر میرا اس پر ایمان ہے۔ حضور محبوب پاک نے ایک بار آپ کو کچھ اداس دیکھا تو سبب دریافت کیا۔ آپ نے عرض کیا۔ آج مجھے حضرت خضر علیہ السلام سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ میں نے حضرت سے کہا۔ آپ نے موسیٰ علیہ السلام کو باطنی تعلیم دی ہے۔ کچھ اس فقیر کو بھی فیض پہنچایئے۔ حضرت نے فرمایا۔ تم کیا فیض چاہتے ہو۔ میں نے کہا۔ فصاحت بلاغت کا حضرت خضر نے فرمایا۔ یہ فیض میرے لعاب دہن میں امانت تھا۔ وہ شیخ سعدی کو دے چکا۔

اس سوکھے جواب پر میرا دل بگڑ گیا۔ حضور محبوب پاکؒ نے فرمایا۔ اتنی سی بات کے لئے رنجیدہ بیٹھے ہو۔ آؤ میں تمہیں اپنا لعاب دہن کھلا دوں۔ حضرت امیر سلام کر کے حضور کے پاس جا بیٹھے۔ حضرت ممدوح نے انگشت مبارک لعاب دہن میں تر کر کے حضرت امیر کے ہونٹوں کو

لگادی۔ اللہ اللہ وہ تری آبحیات یا اکسیر آلٰہی تھی۔ جس نے آن کی آن میں الم نشرح لک صدرک۔ کی کیفیت دکھادی۔ آج تک اسی فیض کی برکت ہے۔ جو حضرت امیر کے کمالات کی ہندوستان سے لے کر یورپ تک دھوم ہے۔ اور آپ کی تصانیف ولایت کے میوزیم اور لائبریریوں میں جگا جگا کر رکھی جاتی ہے۔

اعجاز خسروی جب ایران پہنچی تو اس سمندر کو دیکھ کر وہاں کے انشاء پرداز اور شاعر چکرا گئے۔ جواب تو اس کا کسی سے دیا نہ گیا۔ مگر کھسیانے ہو کر یہ کہہ دیا کہ " این زبان ما نیست "

مجھے اتنی مہلت نہیں ہے کہ میں حضرت امیر کی نظم و نثر کے کمالات پر ریویو کروں۔ اور بتاؤں کہ آپ کی فارسی کیا ہے۔ اور زابلی، کابلی سعدی پہلوی۔ دری۔ وغیرہ ایرانی زبانوں میں سے آپ کے کلام میں کون کونسی زبانیں آئی ہیں۔ اور آپ کے کلام نے کیا قبولیت پائی ہے۔ صرف اتنا لکھتا ہوں کہ آپ کی یہ شان ہے کہ حضور محبوب پاک نے فرمایا۔ خدا اگر مجھ سے پوچھے گا۔ کہ نظام الدین تو دنیا میں سے میرے لئے کیا تحفہ لایا ہے۔ تو امیر خسرو کو پیش کروں گا۔ حضرت امیر اور آپ کے کمالات زندہ ہیں اور آپ ہر محفل میں تشریف رکھتے ہیں۔ صوفیہ افضل الفوائد اور راحۃ المحبین کو پڑھتے ہیں۔ اور سر دھنتے ہیں۔ مکتبوں کے بچے آپ کی خالق باری کا سبق لیتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے آپ کی پہلیاں ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اور اپنا جی بہلاتے ہیں۔ لڑکیاں ساون میں آپ

کے گیت جھولے میں بیٹھ کر گاتی ہیں۔ اور اپنے چاؤ کو پورا کرتی ہیں گھر کی بیٹھنے والی عورتیں پتی ورتا اپنے خاوندوں کے فراق میں حضرت امیر کے گیت گاتی ہیں۔ اور اپنے درد دل کا علاج کرتی ہیں۔ سبحان اللہ امیر صاحب کی بھاشا کی لطافت کیا لکھی جائے۔ اس مصرعہ کو پڑھ کر مزہ لیجئے۔

سکھی پیا کو جو میں نہ پاؤں تو کیسے کاٹوں اندھیری تیاں

یہ معلوم ہوتا ہے کہ کنہیا جی مہاراج دوارکان کو سدھار گئے ہیں۔ اور راوکھا جی فراق میں گھبراتی ہیں۔ اور یہ بول اپنی زبان سے کہہ رہی ہیں بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت محض بھاشا جانتے تھے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ نائک کے لئے لازم ہے کہ وہ موسیقی علماً اور تفنناً دونوں طرح جانے۔ اس لئے آپ ضرور سنسکرت کے ماہر تھے۔ مگر اپنے مذہبی اور قومی کمالات کے سامنے اس سے زیادہ کام نہیں لیا۔ آپ اس ہمہ دانی اور قابلیت پر بڑے منصف مزاج اور ہنر مند تھے۔

جب حضرت حسن علاء سنجری آپ کے پیر بھائی نے فوائد الفواد شریف لکھی تو آپ کو بہت پسند آئی۔ آپ نے حسن علاء سنجری سے کہا میں اپنی ساری تصانیف پر آپ کا نام ڈال دوں۔ اور آپ انہیں لیلو۔ اور یہ رسالہ مجھے آپ عنایت کردیں۔ میری ساری تصانیف سے آپ کی فوائد الفواد اچھی ہے۔ حضرت حسن نے کہا۔ بہت اچھا۔ آپ کی تصانیف آپ کو مبارک رہے۔ اگر آپ کو میری کتاب پسند ہے۔ تو میں نذر کردوں گا۔ مگر میں حضرت پیر و مرشد سے پوچھ لوں۔ کیونکہ میں اسے حضور میں گزران چکا ہوں۔ اگر

بغیر اجازت حضرت کے اس میں کچھ تبدیلی کروں گا۔ تو باز پرس ہو گی۔ حضرت امیر نے کہا بہت مناسب ہے۔ حضرت سے استمزاج کر لیجئے۔ حضرت حسن علاء سنجری نے موقعہ پا کر یہ حال حضور محبوب پاک کی خدمت میں عرض کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ ہم اس کا جواب امیر خسرو ہی کو دیدیں گے۔

حضرت امیر حضور والا کے پاس حاضر ہوئے۔ تو آپ نے مسکرا کر فرمایا امیر! ماشاء اللہ تم تو ملک الشعراء۔ طوطی ہند ہو۔ تمہاری تصنیف کا کیا ٹھکانا ہے۔ گنتی میں بھی نہیں آتیں۔ اور بیچارے حسن نے مرکھپ کر ساری عمر میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ وہ تمہارے کہنے کو نہیں ٹال سکتا ہے۔ وہ تمہیں دے دیگا۔ مگر میرے نزدیک تو یہ اسی کو بخش دو۔ شاید اسی کتاب سے اسے کچھ شہرت ہو جائے۔

غرض حضرت امیر کے کمالات کے بیان کرنے کو بڑا وقت درکار ہے حضرت میر عبدالواحد بلگرامی واسطی زیدی رحمۃ اللہ علیہ کتاب سبعہ سنابل میں فرماتے ہیں۔ کہ جب حضرت امیر خسرو رح دہلوی نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا۔ تو دہلی میں تہلکہ مچ گیا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک آپ کے سوگ میں تھے۔

شیخ رکن الدین سہروردی ایک کامل بزرگ تھے۔ آپ نے کہا افسوس ہے آج امیر خسرو رح طوطی ہند ملک الشعراء اس جہان سے گزر گئے۔ ان کے صاحب کمال ہونے میں تو شک نہیں ہے۔ مگر بادشاہوں کی صحبت میں رہے ہے۔ اور ان کی تعریف میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں۔ اس لئے

ہمیں خیال ہے۔ کہ دیکھئے خدا سے کیسی بنتی ہے۔ اُن کے جنازے پر جاکر ہمیں اُن کی مغفرت کے لئے دعا کرنی چاہیئے۔ یہ کہہ کر اٹھے اور جبہ درویشی پہن اور مریدوں کو ساتھ لے کر تشریف لے آئے۔ اور حضرت امیر کے جنازے کے پاس بیٹھ گئے۔ ابھی دعا کے لئے ہاتھ نہ اٹھائے تھے۔ جو حضرت امیر اپنے کفن مبارک کو کھول کر اٹھ بیٹھے۔ اور ہنس کر کہا۔ شیخ رکن الدین صاحب! ؎

ما بہ نعمت ہائے پیر خود کفایت کردہ ایم
نیست ما را حاجت آمرزش آمرزگار

یعنی مجھے اپنے پیر و مرشد کا وسیلہ کافی ہے۔ کسی اور کی بخشش اور سفارش کی حاجت نہیں ہے۔

یہ کہہ کر آپ پھر لیٹ گئے۔ اور شیخ رکن الدین صاحب کو معلوم ہو گیا کہ حضرت امیر کیا شان رکھتے ہیں۔ بارک اللہ۔ حضرات چشت بھی کیا چیز ہیں۔ آپ ہی مُردہ آپ ہی مسیحا۔ چاہے مر جائیں، چاہے جی جائیں۔

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے جب حضرت خواجہ الہ بخش صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ سلیمان قدس سرہ العزیز کے پوتے زیارت کے واسطے دہلی آئے۔ تو بہادر شاہ مرحوم آپ کے لینے کے لئے حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی قدس سرہ العزیز کی درگاہ تک گئے۔ اور لال قلعہ میں آپ کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد بہادر شاہ نے خواجہ الہ بخش صاحب سے ہاتھ باندھ کر کہا۔ حضور دعا فرمائیں کہ میری سلطنت کو ایسا عروج ہو جائے

جیسا کہ جلال الدین اکبر اور اورنگ زیب کی سلطنت کو تھا۔ حضرت نے
نے اس کے جواب میں فرمایا۔ جس دن سے تم لوگوں نے محمد شاہ پیا کی قبر
پر سنگ مرمر کا پنجرہ (محجر) بنا کر کھڑا کیا ہے۔ اسی دن سے حضور محبوب
پاک اور تمام خواجگان چشت مغلوں سے ناخوش ہو گئے ہیں۔ اور لال قلعہ
پر زوال آگیا ہے۔ کیونکہ تم نے عاشق معشوق کے نظارے میں خلل ڈالدیا
اور پردہ لگا دیا۔ اگر تم اس پنجرے کو اکھڑوا کر پھینک دو۔ تو میں دعا کروں۔
بادشاہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ کہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔
حضرت خواجہ الہ بخش صاحب نے فرمایا۔ تو مجھ سے دعا بھی نہیں ہو سکتی +

دِلّی کے پوشیدہ ارباب کمال

شاہ بھورے صاحب رحمۃ اللہ علیہ

پریڈ کے میدان میں جہاں حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی قدس
سرہ العزیز کا مزار پُرانوار ہے۔ ٹھنڈی سڑک سے ادھر بالکل سیدھ میں
لال قلعہ کی خندق پر ایک پرانے درخت کے سایہ میں ایک پکی قبر بنی ہوئی
ہے۔ قبر کے سرہانے ایک چراغدان گچ کا ہے۔ جس میں سر شام عقیدت مند
لوگ چراغ جلاتے ہیں۔ اور جمعرات کو تو یہاں بہت سے مرد اور عورتیں جو

جو اولیاء اللہ کی چاہنے والی ہیں۔ دیکھنے آتی ہیں۔ گھی کے چراغ روشن کرتی ہیں۔ تبرک بٹتا ہے۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیئے گھما گھمی ہو جاتی ہے۔ نماز پڑھنے والے چھوٹے سے چبوترہ پر جو وہاں بنا ہوا ہے۔ مغرب کی نماز بھی پڑھ لیتے ہیں۔ جہاں تک چھان بین کی اور جس قدر بزرگوں سے سنا یہی معلوم ہوا کہ یہ شاہ بھورے صاحب کا مزار ہے شاہ بھورے صاحب حضرت اکبر ثانی اور ابو ظفر بادشاہ دہلی کے عہد میں ایک مجذوب گزرے ہیں۔ اسی جگہ جہاں اب پڑے سو رہے ہیں۔ دن رات بیٹھے رہتے تھے۔ اور ایک کمبل سے بدن ڈھانکے رہتے تھے سر کے بال اور ناخن بڑھے ہوئے۔ لانے والے طرح طرح کے کھانے اور مٹھائیاں لاتے تھے۔ مگر آپ انہیں آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھتے جو کسی نے کھلا دیا۔ وہ کھا لیا۔ جو پلا دیا وہ پی لیا۔ اور لے جانے والے وہ ساری نعمتیں اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے تھے۔ شاہ صاحب سیف زبان تھے جو کہہ دیتے تھے وہ ہو جاتا تھا۔ اسی واسطے ہندو مسلمانوں کے ٹھٹھ لگے رہتے تھے۔

جب تک لاکھ سستی نہ ہوئی تھی۔ تو ہماری دلی میں بیاہ شادی کے موقعہ پر عام دعوت کے لئے پیالہ رکابیاں۔ طشتریاں لاکھی کام میں آیا کرتی تھیں۔ اور عطاروں کے ہاں لاکھی مرتبان، لاکھی کلبیاں لاکھی سکوریاں بھی دوا دینے کے لئے آرام دیتی تھیں۔ اسی قسم کی رکابیوں میں شاہ بھورے صاحب کے لیئے لوگ زردہ بریانی لایا کرتے تھے۔ اور جب وہ خالی

ہو جاتی تھیں، تو آپ اُن رکابیوں کو اوپر تلے رکھا کرتے تھے اور چن چن کر اُن کا منارہ بنایا کرتے تھے۔ پھر اُن پر زور سے ہاتھ مارتے تھے۔ اور فرماتے تھے، وہ لال قلعہ ہم نے ڈھا دیا۔ وہ گر گیا۔ وہ اُلٹ گیا۔ اور یہ شغل روز جاری رہتا تھا۔ جو لوگ حاضر ہوتے تھے وہ لال قلعہ کے ڈھنے کا فقرہ سنکر تھرا جاتے تھے۔ اور اپنے دل میں کہتے الٰہی خیر کرنا۔ لال قلعہ کے لئے شاہ صاحب کے منہ سے بُری فال نکلتی ہے۔

حکیم آغا جان صاحب عیشؔ جو چیلوں کے کوچہ میں کلاں محل کے پاس رہتے تھے۔ شاہ بھورے صاحب کے بڑے معتقد تھے۔ یہ وہی حکیم آغا جان عیش ہیں۔ جن کا حال حضرت استاذی شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی نے اپنی کتاب آبحیات میں تحریر فرمایا ہے۔ اگرچہ استاد نے حکیم صاحب کے اشعار آبحیات میں جو قابل انتخاب ہیں تحریر نہیں فرمائے مگر فی الواقعی حکیم صاحب اردو شاعری میں ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اُن کے پوتے مرزا ولی بیگ کے حوالہ سے عرض کرتا ہوں کہ حکیم صاحب بڑے پُر گو شاعر تھے۔ اور آپ نے بارہ دیوان بہت موٹے موٹے ردیف وار مرتب کئے تھے۔ اور وہ اب تک اُن کی ذریات کے پاس موجود تھے۔ مگر آپ اپنی شہرت نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنے صاحبزادے کو وصیت کی تھی کہ میرا کلام کسی کو نہ دکھانا نہ چھپوانا۔ ورنہ میں قیامت میں دامنگیر ہوں گا۔ اچھا دو ایک شعر عیش صاحب کے فقیر فراق کو بھی یاد ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ

کرنے والے سن لیں کیونکہ اب اٹھتی پینٹھ ہے۔ کارواں چلنے کے لئے تیار ہے۔ جرس بج رہا ہے۔ بہت سے ساتھی فراق کے اگلے قافلہ میں روانہ ہو چکے ہیں۔ اور فقیر بھی کمر باندھ چکا ہے۔ حکیم صاحب فرماتے ہیں:۔

اپنے چاہے سے کچھ نہیں ہوتا　　وہی ہوتا ہے جو خدا چاہے

زاہد و رند پہ نہیں موقوف　　وہ سہاگن ہے جسے پیا چاہے

علیش صاحب کو فقیر فراق نے بھی بچپن ہی دیکھا ہے۔ آپ کا مطب ہمارے مکان سے بہت قریب تھا۔ اور اس خطہ کے لئے آپ مسیحا تھے۔ مجھے یاد ہے۔ کہ آپ کے مطب میں سینکڑوں آدمی حاضر ہوتے تھے۔ خیر حکیم صاحب کو جب فرصت ملتی شاہ بھورے صاحب کی خدمت میں پہنچتے اور گھنٹوں آپ کے سامنے بیٹھتے۔ شاہ بھورے صاحب ہر وقت خواجہ حافظ شیراز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر پڑھا کرتے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

حکیم صاحب فرماتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ اور شاہ صاحب نے میرے سامنے دس بیس دفعہ یہ شعر نہ پڑھا ہو۔ یہاں تک کہ شاہ صاحب کا وقت رحلت آگیا۔ ایک دن لوگوں نے جاکر دیکھا کہ شاہ صاحب کا قالب پاک کمبل میں لپٹا پڑا ہے۔ اور روح فردوس اعلیٰ کو سدھار گئی ہے۔ خبردار نے حضرت بادشاہ ابوظفر کو خبر دی کہ آج رات کو کمبل پوش فقیر جو مدت سے حضرت کے لال قلعہ کی

کھائی پر دھونی رمائے بیٹھا تھا فوت ہوگیا۔ اس کے لئے کیا حکم ہے۔ بادشاہ سلامت نے فرمایا۔ جہاں اس فقیر نے دم دیا ہے۔ اسے اسی مقام پر نہلا دھلا کر جنازہ کی نماز پڑھوا کر بہت احترام سے دفن کر دو۔ چنانچہ اسی جگہ جہاں آپ کی قبر ہے۔ گاڑ دیئے گئے۔

حکیم آغا جان صاحب عیشؔ جس طرح شاہ صاحب کی زندگی میں آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ اسی طرح ان کی وفات کے بعد اُن کے مرقد پر حاضری دینے لگے۔ آندھی آئے مینہ آئے کچھ ہو مگر حکیم صاحب کا پھیرا ناغہ نہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء نے مغلیہ سلطنت کے تخت کو تخت تابوت سے بدل ڈالا۔ دلی تباہ ہو گئی۔ اور حکیم صاحب کو شاہ بھورے صاحب کا کہنا یاد آیا۔ کہ وہ لال قلعہ گرا دیا۔ وہ ڈھا دیا۔ اور اب حاکم وقت نے جا بجا توڑ پھوڑ شروع کی۔ اردو بازار خاص بازار۔ خانم کا بازار۔ بلاقی بیگم کا کوچہ۔ یگوہ باڑی۔ کاغذی محلہ۔ زنگاری پردہ۔ نواب عالیہ بیگم کا محل کیشورائے ہرکارہ کی حویلی۔ اور خدا جانے کیا کیا مسمار ہو گئے۔

ایک دن صبح کے وقت حکیم صاحب شاہ بھورے صاحب کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ جو انہوں نے دیکھا کہ ایک یورپین افسر گھوڑے پر سوار بڑی تمکنت سے چلا آتا ہے۔ اور اس کی جلو میں بہت سے نوکر اور بیلدار اور مزدور ہیں۔ اس نے شاہ بھورے صاحب کے مزار پر آکر اپنے گھوڑے کی باگ روک لی۔ اور اپنے ایک ماتحت سے کہا یہ قبر یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ کل صبح اسے توڑ پھوڑ کر پھینکدیا جائے۔ اور

جگہ صاف کر دی جائے۔ ماتحت نے کہا بہت خوب کل ایسا ہی کیا جائے گا۔
یورپین افسر آگے بڑھ گیا۔ اور اس کا عملہ بھی اس کے پیچھے گیا۔

حکیم صاحب کے دل پر اس حکم کی چوٹ لگی۔ مگر سوائے اس کے اور کیا کر سکتے تھے۔ کہ انہوں نے سید بھورے صاحب کے مزار پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
واہ شاہ صاحب واہ! بس دیکھ لیا آپ کا جذبہ۔ آپ جو اپنی زندگی میں فرمایا کرتے تھے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

بالکل فضول تھا۔ اگر عاشقوں کے نام دوام کا پٹہ لکھا جاتا تو آپ کی قبر نہ کھدوائی جاتی۔ اب کل جو میں آؤں گا۔ تو آپ کی ہڈی پسلی کا نام و نشان بھی یہاں نہ ملے گا۔ اتنا کہہ کر حکیم صاحب گھر چلے آئے۔ اور اس قلق میں رات بھر نیند نہ آئی۔ صبح کی نماز پڑھ کر شاہ صاحب کے مزار پر جا بیٹھے تاکہ اپنی آنکھوں کے سامنے روز محشر کا تماشہ دیکھیں۔ کدال پر کدال پڑ رہی ہو۔ اور اینٹ سے اینٹ بج رہی ہو۔

طلوع آفتاب کے بعد وہی یورپین افسر گھوڑے سوار تشریف لے آئے۔ اور آج بھی ان کے ہمراہ بہت سے آدمی تھے۔ صاحب نے گھوڑا روک کر اپنے ماتحت سے کہا۔ کل میں نے اس قبر کے کھودڈالنے کا حکم دیا تھا۔ مگر آج میں اپنے اس حکم کو منسوخ کرتا ہوں۔ اس قبر کے رہنے سے ہمارا کوئی ہرج نہیں ہے۔ اسے نہ چھیڑا جائے۔ یہ فرما کر صاحب لمبے ہوئے

اور انگریز بہادر کی یہ بات سن کر حکیم صاحب کو پسینہ آگیا۔ حکیم صاحب نے شاہ صاحب کے مزار پر بہت گداز دل سے فاتحہ پڑھ کر کہا۔ شاہ صاحب آپ کا شعر پڑھنا بالکل بجا تھا۔ بے شک آپ حضرت فانی باللہ اور باقی باللہ ہوگئے ہیں جینے مرنے سے آپ لوگوں کو کوئی جوکھوں نہیں ہے۔ اور قرآن میں جو آپ لوگوں کی نسبت آیا ہے۔

اِلَّا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْن

بالکل صحیح ہے۔ اس سے زیادہ حالات سید بھورے صاحب کے اور آپ کی صحیح تاریخ وفات ٹھیک۔ ٹھیک نہ ملی۔

میرزا محمد امیر الملک عرف میرزا بلماقی صاحب گورگانی بادشاہزادہ جو ابو ظفر بادشاہ دہلی کے بھانجہ ہوتے ہیں۔ اور غدر سے پہلے کی یادگار ہیں۔ اور سرکار نظام آصف جاہ اور سرکار برطانیہ سے وظیفہ پاتے ہیں۔ اُن سے بھی میں نے بھورے شاہ صاحب کی نسبت پوچھا گچھا۔ تو آپ نے فرمایا۔ مجھے اور تو کوئی بات معلوم نہیں۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ میں کئی بار نظر باز لوگوں کو لے کر اُن کے مزار پر گیا ہوں۔ اور میں نے اور اُن حضرات نے بیٹھکر مراقبہ کیا ہے تو یہ دریافت ہوا کہ آپ درحقیقت مجذوب نہیں تھے بلکہ سالک تھے اور مقامات عالیہ باطنیہ پر آپ کا تصرف ہے۔ اور اپنے فیض کو طالب کے قلب پر برسا دیتے ہیں۔ اور میں نے بھی آپ کے مزار سے بہت برکات حاصل کی ہیں۔ مگر میں نے سید بھورے صاحب کو زندگی میں نہیں دیکھا۔ میرے ہوش سے پہلے شاہ صاحب رحلت

کرچکے تھے۔ ہمارا مکان بگوا باڑی میں سنہری مسجد کے پاس جو لال قلعہ کے نیچے اب تک کھڑی ہے۔ غدر سے پہلے قائم تھا۔ اور اسی مقام پر میری ولادت ہوئی ہے۔

فراق دہلوی کے سفرنامہ کا ایک ورق

دوست دشمن کو ترے ناز نے اکثر مارا
ایک ہی وار میں دونوں کو برابر مارا

جب سیاح بمبئی سے جی آئی پی ریلوے میں ناسک ہوکر جبل پور الہ آباد۔ بنارس کی طرف بڑھتا ہے۔ تو نند گاؤں اسٹیشن سے اسے ریلوے کی دوسری شاخ پر سوار ہونا پڑتا ہے۔ جو اورنگ آباد دکن کو جاتی ہے اور اسی ریلوے کے ذریعہ سے دولت آباد کا قلعہ اور ایلورا کے غار دیکھ سکتا ہے۔ ایلورا کے غاروں میں جو بت خانہ اور تصویریں اور مورتیں پتھر میں کندہ ہیں یا جو مورتیں بت خانوں کی دیوار و در پر تراشیدہ ہیں، انہیں دیکھ کر مجھ جیسے ناتراشیدہ اور جاہل ہندوستانی اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ جیسے دیوالی کے کھلونوں اور عید بقرعید والے دن کمہار کی بنائی ہوئی مورتوں کو دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں۔ بس اتنا جان لینا کہ یہ مٹی کا ہاتھی اور یہ مٹی کا مور اور مرغا ہے۔ ہدف مارنا ہے۔ علم پر کوئی

اللہ کا بندہ غور نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ ٹوٹی پھوٹی تاریخ میں یہ دیکھ لینا کافی ہے۔ کہ اجنٹا اور ایلورا اور گھارا پوری میں بت خانہ ہیں۔ وہ سب بدھ دیوتا کی یادگار ہیں۔ مگر انہیں لبنت کی خبر نہیں۔ وہ انگریزی تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان مقامات میں سب بدھ دیوتا کی یادگار تصویریں اور مورتیں نہیں۔ بلکہ ان میں جین مت۔ بعض برہمنی مت اور بعض بدھ مت کی یادگار ہیں۔ اور ان کے بنانے اور تراشنے میں سینکڑوں برس کا فاصلہ ہے۔ جب آپ اجنٹا کے غار میں داخل ہوں گے تو علاوہ اور سنگین مرقعوں کے غار کی دیوار پر ایک مجلس کا نقشہ دیکھیں گے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ایک نوجوان جو کلے ٹھلے کا انسان ہے۔ مسند پر غنج و دلال کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ایرانی لباس پہن رہا ہے۔ اس کے سر پر ایک پگڑی نما ٹوپی ایسی ہے جیسی کبھی یورپین لوگ رات کو موٹے اور گول کناروں کی پہنا کرتے تھے۔ اس نوجوان کی ڈاڑھی چھوٹی ہے۔ اور مونچھیں بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بھرے پپوٹوں کی ہیں۔ جو کہتی ہیں کہ آل تیمور کی جو چشم مخمور کہلاتی ہے۔ وہ ہماری یگانگت کی خبر دیتی ہے نوجوان کے ہاتھ میں ایک چوکور پیالہ ہے۔ اور اس کے سیدھے پہلو میں ایک نازنین گل اندام بیٹھی ہے۔ نازنین کا بھی زنانہ ایرانی لباس ہے۔ خصوصاً اس کے گلے میں ایک کرتی ہے۔ جس کے سر دست دو تین چوڑیاں چمک رہی ہیں۔ اس نازنین کے کانوں میں بھی چھوٹی چھوٹی بالیاں ہیں۔ اس کی ناک میں بلاق ہے۔ جو نیچے کے ہونٹ پر پڑا ہوا ہے۔ اور لاکھ لاکھ .

بناؤ کر رہا ہے۔ ناز نین کی چوٹی کسی ہوئی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ اور اور اس کے چہرے پر امارت اور حسن وجمال کی ایسی جھلک ہے جیسے کچھ دیر دیکھنے سے ایک عاشق مزاج اپنا گریبان چاک کرسکتا ہے ؎

مکھڑا یہ غضب زلف سیہ فام یہ کافر
کیا خاک جئے کوئی شب ایسی سحر ایسی

اور ان محب ومحبوب کے دونوں طرف دو ایرانی کنیزیں کھڑی ہیں۔ جو ایک پشواز نما جامہ پہن رہی ہیں۔ جس کے نیچے کا حصہ اس زمانہ کے کھڑے پائچہ سے ملتا جلتا ہے۔ جو دلی میں عورتیں پہننے لگی ہیں۔ پائچوں میں جھالر لگی ہے۔ جس کی چنت چنت الگ دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح اس آقا اور پہلو نشین بیگم کے چہروں پر شان بادشاہی عیاں ہورہی ہے۔ اسی طرح ان کنیزوں کے تمام اعضاء سے لونڈی پن کے آداب ظاہر ہو رہے ہیں۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک شیشہ ہے۔ جس کے اندر بادہ مردافگن ہے۔ مسند کے نیچے دو غلام ایرانی کپڑے پہنے موٹے کناروں کی ٹوپی سر پہ رکھے نگاہیں نیچے کئے دو قابیں ہاتھوں میں لئے بیٹھے ہیں۔ جن کے اندر گزک اور نقل ہیں۔ اس پتھر کے مرقع کے چاروں کونوں پر کچھ پھولوں کے درخت ہیں۔ اور ایک کونے کے پھولوں کو دو ہنس نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ اس لئے ان کی لمبی گردن کا مروڑ کھل گیا ہے۔ اور گردن سیدھی ہورہی ہے۔ اس ہئیت خاص کو دیکھ کر ایک عاقل دنگ ہوجاتا ہے۔ اور اس کا دل کہتا ہے کہ مانی وبہزاد کے موقلم میں ضرور یہ لچک ہے کہ

کہ ہاتھی دانت کے بیضہ یا کاغذ کی سطح پر جیسی چاہے تصویر بنا دے۔
اس وقت میں فوٹو کا کیمرہ ایسا نکلا جو پلیٹ پر ہر چیز کا عکس جما دیتا ہے
اور مصالحہ پر جوں کی توں صورت اتر آتی ہے۔ مگر آفریں ہے ہندوستان
کے اگلے سنگ تراشوں پر جو سنگ خارا پر لوہے کے معمولی اوزاروں سے
ایسی تصویریں بناتے تھے۔ جو مانی و بہزاد اور فوٹو گرافروں کو پرے بٹھاتے
تھے۔ ایلورا اجنٹا کے بت خانے حضرت مسیح سے دو سو برس پہلے کے ہیں
مگر اس مرقع کی عمر تقریباً تیرہ سو برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ مسٹر فرگسن
لکھتے ہیں کہ دراصل یہ مرقع خسرو پرویز اور اس کی معشوقہ شیریں کا ہے۔
اجنٹا کے غار خسرو کے عہد میں ایک دکن کے راجہ کے قبضہ میں
تھے۔ اور اس راجہ کا خسرو پرویز بادشاہ ایران سے بڑا دوستانہ تھا۔
خسرو پرویز نے اپنی اور شیریں کی مجلس آرائی کا یہ مرقع اپنے دوست دکن
کے راجہ کو ایک ایلچی کے ہاتھ بھیجا تھا۔

راجہ نے یہ تصویر اپنے ہاں کے سنگتراشوں کو دی۔ اور انہیں حکم
دیا کہ اسے اجنٹا کے غار میں ایسا بناؤ کہ اصل نقل میں فرق نہ رہے۔ جب
کاریگروں نے یہ مرقع پتھر کی دیوار پر اتار کر ٹھیک کیا تو دکن کا راجہ معہ
ایرانی سفیر کے اجنٹا گیا اور دیکھا کہ فی الواقع سارا نقشہ اور تصویریں ہوبہو
پتھر پر کھدی ہوئی ہیں۔ مگر اس میں یہ خوبی بڑھی ہوئی ہے کہ دیکھنے والوں کو
معلوم ہو رہا ہے کہ خسرو اور شیریں زندہ بیٹھے ہیں۔ اور اب منہ سے بول
اٹھیں گے۔ بادشاہ ایران کا سفیر ہندو نقاشوں کا یہ کام دیکھ کر حیران ہو گیا۔

اور سوائے اس کے اس کے منہ سے اور کچھ نہ نکلا کہ "بہ یزدان پاک بہ یزدان پاک این نیرنگ ست"۔

سفیر ایران جب واپس ہو کر مداین پہنچا۔ تو اس نے خسرو پرویز سے دکن کے راجہ کی یہ قدر دانی اور وہاں کے کاریگروں کی یہ انوکھی کاریگری بیان کی۔ تو خسرو بہت خوش ہوا۔ اور اس نے راجہ کو بڑا شکریہ لکھا۔ یہ وہی خسرو پرویز ہے۔ جس کے آگے ہمارے حضور پُر نور خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نامہ مبارک ایلچی نے پیش کیا۔ تو اس نے اس بات پر چڑ کر چاک کر ڈالا کہ ہمارے نام سے پہلے اس شخص (محمدؐ) نے اپنا نام کیوں لکھا۔ اور جس وقت حضور نے اس گستاخی کو سنا۔ تو آپ نے فرمایا۔ الٰہی اس گستاخ کو اس کے کردار کا بدلا چکھا دے۔ اور اس کے بیٹے شیرویہ نے خسرو کے پیٹ کو چاک کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ اور یہ بی بی شیریں بھی وہی ہیں۔ جن کی داستان عشق کو حضرت مولانا گنجوی قدس سرہ العزیز نے نظم کر دیا ہے۔ یہ وہی شیریں جان ہیں۔ جن کی الفت نے فرہاد کو دیوانہ بنایا۔ اور تیشہ سے ہلاک کروایا۔ مگر فرہاد کے تیشہ نے شیریں کو بھی مزہ چکھایا۔ جب شیرویہ باپ کو مار چکا تو اس نے شیریں سے کہا۔ آپ جانتی ہیں ہم زردشتی مذہب رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی سگی ماں سے نکاح جائز ہے۔ اور آپ تو میری سوتیلی ماں ہیں۔ اور میرا دل مدت سے آپ کی زلف گرہ گیر میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لئے دست بستہ عرض کرتا ہوں۔ کہ جشن شادی کی کوئی تاریخ مقرر کیجئے۔ شیریں نے کہا کیا مضائقہ ہے۔

جشن کی تیاری کی جائے۔ آج شب کو مجھے اس دخمہ (تہ خانہ) میں پہنچوادو۔ میں تمہارے باپ کے تابوت کی زیارت کرکے رخصت ہوں۔ جب رات ہوئی۔ تو شیریں نہا دھو سنگار کرکے عطر اور خوشبو میں بس کر اس تہ خانہ میں پہنچی جس میں خسرو اور خسرو کے بڑوں کے تابوت رکھے ہوئے تھے۔ بہت سی شمع روشن تھیں۔ بخور جل رہی تھی۔ شمع کے گرم گرم آنسو یہ بہ کر کہتے تھے۔ دنیا فانی ہے۔ دنیا کی بادشاہی فانی ہے۔ دنیا کے عیش ونشاط فانی ہیں۔ شیریں نے ساتھ کی کنیزوں سے کہا۔ تم تہ خانے کے باہر جاؤ۔ جب تہ خانہ میں تخلیہ ہوگیا۔ تو شیریں نے اندر سے تہ خانہ کا دروازہ بند کیا۔ خسرو کے تابوت کا ڈھکنا اٹھایا۔ مردہ کے منہ سے کفن سرکایا۔ اور اسے نگاہ شوق سے دیکھ کر بھر دسا تیر کی اس نے دعائیں پڑھ کر خسرو کی روح کو بخشیں۔ پھر اس نے مردہ خسرو سے کہا۔ اے میرے حسن وجمال کے قدرداں! اے میرے چاہنے والے! اے میرے خاوند اور خداوند!! تیرا بیٹا مجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ زردشتی مذہب میں یہ ہر طرح جائز ہے۔ مگر میرا رومی خون ہے۔ جو میری رگوں میں چکر کھا کر مجھ سے کہتا ہے کہ تو بھی ورتا ہے۔ تو شوہر پرست ہے یہ کب ہو سکتا ہے۔ کہ تجھے خسرو کے سوائے کوئی دوسرا مرد ہاتھ لگائے۔ بیشک نہیں ہوسکتا۔ دیکھ میں تیری محبت میں اپنی عصمت بچانے کے لئے اسی طرح اپنی جان دیتی ہوں جس طرح تیری جان لی گئی ہے۔

یہ کہہ کر اس نے اپنا خنجر آبدار اپنے پیٹ میں گھنگول لیا۔ اور

خسرو کے تابوت پر اوندھی گر کر جان شیریں خدا کو سونپ دی۔

اے عشق! تیرے زور شور جیسے تیرہ سو برس پہلے تھے اب بھی بدستور ہیں۔ دن رات تیرا خنجر چلتا ہے۔ نامردوں کی جانیں جاتی ہیں۔ نہ تجھ سے کوئی جیتا۔ نہ آگے کوئی جیتے گا۔

(۲۰)

چار بیٹیاں

حسین بیگ قندھاری ہمایوں کی فوج میں داخل ہو کر ہندوستان میں آیا۔ اور خاک دامنگیر نے اس کو قندھار جانے نہ دیا۔ اپنے دیس میں بھی وہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اور یہاں آکر بھی اُس نے ہتھیار کھول ہل بیل لے لئے۔ رتن پور ضلع بلند شہر میں چار بیگھہ زمین مول لے کر اپنے پرانے دھندے میں لگ گیا۔ اور ربیع خریف دونوں فصلوں میں کئی سو من اناج پیدا کر لیتا۔ نوجوان تھا۔ اس لئے گاؤں کی ایک عورت سے اُس نے نکاح کر لیا جس کا نام لطف النساء تھا۔

لطف النساء کے پیٹ سے حسین بیگ کے گھر میں چار برس کے اندر چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ باپ ولائتی مغل، چاروں کی چاروں لڑکیاں قندھاری انار کی طرح سرخ رنگ اور خوبصورت ہوئیں۔ مغل نے بڑی کا نام شاہ بانو۔ دوسری کا جاہ بانو۔ تیسری کا نام شمشاد بانو۔ اور چوتھی کا

سر و آزاد بانو رکھا۔ مگر ان لڑکیوں کی بدقسمتی دیکھئے۔ چوتھی لڑکی کا دودھ بھی چھٹنے نہ پایا تھا کہ حسین بیگ قولنج میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ اور لطف النساء رانڈ ہو گئی۔ اور اسے لڑکیوں کا پالنا بھی دوبھر ہو گیا۔

زمین بک گئی۔ اور لطف النساء اور اس کی بچیاں دانہ دانہ کو محتاج ہو گئیں۔ ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ لطف النساء جوع الکلب کی بیماری میں مبتلا تھی۔ جسے ہندی میں ہَوکا کہتے ہیں۔ جتنا کھاتی، اتنی ہی بھوکی رہتی۔ کھاتے کھاتے تھک جاتی۔ تو اپنے دل سے کہتی۔ دھیرا رہ چرا کھاؤں گی

گاؤں کے رہنے والے اکثر بیٹیوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ خواہ ہندو تھے یا مسلمان۔ اس لئے بہت لوگ لطف النساء سے کہتے۔ لڑکی پرایا دھن کہلاتی ہے۔ اور کنبہ اور قبیلہ اور گاؤں اور محلہ کی ناک کاٹتی ہے۔

اس کو تو جس دن جنم لے اسی دن چلتا کر دو۔ یہ چاروں بڑی بھنڈری ہیں اپنے باپ کو کھا گئیں۔ نوجوان ہونے سے پہلے پہلے ایک ایک کو چپکے چپکے زہر دیکر مار ڈال۔ آج کل اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ ہمایوں جگت کا ٹھگ پردیس سے مارا دھاڑا آیا ہے۔ اسے ابھی اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہے۔ پرائے خون کی کیا چھان بین کرے گا۔ اور اگر کرے گا تو ہو گا کیا۔ کنیاں کا مار دینا بڑا اپن ہے۔ سارا گاؤں ایک منہ ہو کر تھانہ دار سے کہہ دیگا۔ لڑکیاں دکھ بیماری میں مری ہیں۔

لطف النساء لوگوں کے بہکائے سکھائے میں آ گئی۔ اس نے کئی بار چاہا کہ اپنی لڑکیوں کا کام تمام کر دے۔ مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔

اس گناہ کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ اور لیت ولعل میں بڑی لڑکی چودہ برس کی ہوگئی۔ ان لڑکیوں کو بر بھی نہ ملتا تھا۔ کیونکہ لطف النساء اور مغل کو گاؤں والے کم ذات سمجھتے تھے۔ جب لڑکیاں لطف النساء کے گلے کو آگئیں تو مرتا کیا نہ کرتا۔ اس نے لڑکیوں کو مار ڈالنے کی دل میں ٹھان لی۔ اور ایک دن صبح ہی ان چاروں کو لے کر بیر کھلانے کے بہانے سے جنگل کو گئی۔ اور اس دھیان میں پڑی کہ کسی کنوئیں یا تالاب میں چاروں کو ایک دم سے دھکیل دوں۔ وہ اس سڑک کو جو رتن پور ہو کر دلی کو گئی ہے۔ کاٹ کر ادھر جانا چاہتی تھی۔ جو بیچ میں ایک مردانی پینس حائل ہوگئی۔ جس میں ایک امیرزادہ نوجوان خوبصورت سوار تھا۔ دس سوار پینس کے آگے۔ اور دس سوار ہتیار بند اُس کے پیچھے تھے

لطف النساء اور چاروں لڑکیاں پینس کے پاس پہنچ گئیں تھیں۔ اس لئے اس نوجوان نے ان سب کو اچھی طرح دیکھا اور خاص طور پر اس کی آنکھ شاہ بانو پر پڑی جس کی رسیلی آنکھوں کی گردش نے بتایا کہ وہ وقت قریب آلگا ہے۔ کہ جوانی کے کنول پر ارمانوں کے بھونرے واری قربان ہونے لگیں۔ پالکی نشین نے بیتاب ہو کر دستک دی۔ اور پینس زمین پر رکھ دی گئی۔ سوار مالک کا اشارہ پاکر دس قدم آگے بڑھ گئے۔

پینس والا سردار (لطف النساء سے مخاطب ہو کر) مائی تم کون ہو۔ اور یہ لڑکیاں تمہاری کون ہیں۔

لطف النساء۔ دولہ، یہ بندی حسین بیگ قندھاری کی رانڈ ہے

یہ میری بیٹیاں حسین بیگ قندھاری کی بیٹیاں ہیں۔ جانہار مرگیا۔ میری مانگ کو آگ لگا گیا۔ اور چاروں کو یتیم کر گیا۔ اب گاؤں والے مجھ پر زور دیتے ہیں کہ ان چاروں کو مار ڈال۔ نہیں تو ہمارے گاؤں سے نکل جا۔ اس لئے ان کو لے کر اس واسطے نکلی ہوں کہ کسی تالاب یا کنوئیں میں ڈبو دوں۔" یہ کہہ کر لطف النساء زار زار رونے لگی۔

سردار۔ میں بھی قندھاری مغل ہوں۔ اور بادشاہ کے ساتھ دلی آیا ہوں۔ مرتضےٰ بیگ میرا نام ہے۔ بادشاہی کام بجا لاکر جاتا ہوں۔ لو یہ پانچسو روپیہ ہیں۔ انہیں لے کر اپنے گھر جاؤ۔ اور اطمینان سے رہو۔ تینوں لڑکیوں کو پالو پوسو۔ اور چوتھی کو میں اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں۔ تم جاننا کہ ایک کنوئیں میں ڈلوائی ہے۔" یہ کہہ کر مرتضےٰ بیگ نے پینس کے گبھے کے نیچے سے تھیلی نکال پانچ سو روپیہ توری کے سے پھول جیسے گن لطف النساء کے حوالہ کئے۔ اور پینس سے باہر آ۔ شاہ بانو کو پینس میں بٹھا پینس کے کیواڑ بھیڑ دیئے۔ اور خود کوتل گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اور چلتے چلتے لطف النساء سے کہتا گیا۔ "جب تمہارا جی چاہے اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے دلی آجانا۔ آغا مرتضےٰ بیگ مصاحب بادشاہ سلامت کی محلسرا پوچھ لینا۔"

یہ لوگ چند منٹ میں لطف النساء کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اور لطف النساء روپیہ اور تینوں لڑکیوں کو لے رتن پور کو مڑی +

:- (۲) :-

برس دن ہولیا ہے۔ اور جاہ بانو چودھویں میں پڑی ہے۔ اُس کی

جوانی، اس کا اٹھان، چڑھتے چاند کے زور شور کو مات دیتا ہے۔ وہی رتن پور کی پکی سڑک ہے۔ جو دلی کو گئی ہے۔ اور وہی جگہ ہے۔ جہاں لطف النسار شاہ بانو کو لئے کھڑی تھی۔ آج وہ جاہ بانو کو بیر کھلانے کے بہانہ سے یہاں تک لائی ہے۔ اور چھوٹی دونوں لڑکیاں بھی ساتھ ہیں۔ ان سب کے لانے کی وجہ وہی اس کی بدنیتی ہے کہ کنوئیں میں دھکا دیدے جو ایک قافلہ سڑک سے گزرا۔ اور قافلہ سالار جاہ بانو کو دیکھ کر لوٹ ہو گیا۔ لطف النسار نے قافلہ سالار کو وہی بکھیڑ دلاے دکھلائے۔ جو مرتضےٰ بیگ کو دکھائے تھے۔ اور تین سو روپے اُس سے لے اور جاہ بانو کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دے رتن پور چلی آئی۔

قافلہ سالار نے روانگی کے وقت لطف النسار سے کہا۔ "میا کبھی تمہارا دل اپنی لڑکی کے دیکھنے کو چاہے تو دلی آکر سوداگروں کے محلہ میں عبدالغفور سوداگر شیرازی کا گھر پوچھ لینا۔ میں مل جاؤں گا۔"

اور اسی طرح تیسرے برس لطف النسار نے شمشاد بانو کا سودا ایک بادشاہی باورچی سے دو سو روپیہ میں رتن پور کی سڑک پر کر لیا۔ جو دلی کا رہنے والا حسین بخش کہلاتا تھا۔ اور چوتھے سال میں سردار بانو سو روپیہ کے عوض عزت حسین نام بادشاہی گندہی کے حوالہ کی۔ اور رنجنت ہو کر رتن پور میں رہنے لگی۔ اور گاؤں میں جو نعمتیں ملتی ہیں۔ وہ مول لیکر کھاتی۔ مگر اس کا پیٹ نہ پہلے بھرا تھا نہ اب بھر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ جو کچھ نقد پاس تھا وہ سب چٹورپن میں اڑا دیا۔ اور فاقوں کی نوبت آگئی۔ ایک درزی سے برقعہ سلوا لیا۔ اور

لڑکیوں سے ملنے کے واسطے دلی چلدی۔ اور تیسرے دن شہر میں پہنچ گئی۔ ڈولی میں بیٹھ ڈولی بانوں کو مرتضےٰ بیگ صاحب کا پتہ بتادیا۔ اور وہ لطف النساء کو ٹھیک پتہ پر لے پہنچے۔

دیوانخانہ۔ محلسرا۔ اور ہاتھی، گھوڑے دکھائی دیئے۔ ڈولی کہاروں نے دیوانخانہ کے صحن میں رکھ کر ایک مہری سے جو محلسرا میں جارہی تھی اندر اطلاع کروائی کہ رتن پور سے سواریاں آئی ہیں۔

مرتضےٰ بیگ حویلی میں تھا۔ رتن پور کا نام سنتے ہی دروازہ پر آیا۔ ڈولی ڈیوڑھی پر رکھی گئی شاہ بانو دوڑی آئی۔ ماں کو اُتار کر حویلی میں لے گئی۔ دونوں مل کر روئیں دھوئیں۔ مرتضےٰ بیگ نے شاہ بانو سے کہا "بیگم تم نواب وزیر کے ہاں اکیلی بیاہ میں جانے سے گھبراتی تھیں۔ ہماری تمہاری خوش قسمتی سے خدا نے اماں جان کو بھیجدیا۔ اب انہیں ساتھ لو۔ اور شام کو نواب وزیر کے ہاں چلی جاؤ"۔

لطف النساء بیٹی کو سچ مچ شاہ بانو بنا دیکھ کر پھولی نہ سمائی۔ سونے میں پیلی۔ اور موتیوں میں سفید ہو رہی تھی۔ لونڈیاں، خواصیں خدمت میں حاضر تھیں۔ مرتضےٰ بیگ مردانہ میں چلا گیا۔ شاہ بانو ماں کو ایک کمرہ میں لے گئی۔ لونڈیوں نے دسترخوان پر کھانا چن دیا۔ اور لطف النساء کھانے میں مشغول ہوئی۔ اور شاہ بانو نے الماری کھول کر پستہ کا مرتبان نکالا۔ اور اس میں سے آم کا مرتبہ نکال کر طشتری میں لطف النساء کے سامنے رکھا۔ لطف النساء نے بہت رغبت سے کھایا۔ اور چپکے سے کہا "دھیرا دہ جراکھاؤ گی"۔

دن کے تین بجے لطف النساء کو لونڈیاں حمام میں لے گئیں۔ اور نہلا دھلا کر مناسب کپڑے پہنا لائیں۔ شاہ بانو نے چار بجے تک بناؤ سنگار کیا۔ مغل مرتضےٰ بیگ نے باہر سے آکر ساس کو آداب کیا اور کہا دو پالکیاں ڈیوڑھی میں لگی ہوئی ہیں۔ بسم اللہ کرکے آپ دونوں صاحب سوار ہو جائیں۔ لطف النساء نے کہا۔ عمر دراز۔ بس اب گھڑی دو گھڑی میں سوار ہوئے جاتے ہیں۔ اور اس کمرہ میں گئی۔ جس میں کھانا کھایا تھا۔ اور بیٹی نے جو سفید دوشالہ اوڑھا یا تھا اس میں الماری میں سے مربہ کا مرتبان نکال۔ بغل میں مارا۔ اور دوشالہ سے اس طرح چھپا لیا کہ کسی کو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ بغل میں کچھ ہے۔ دونوں ماں بیٹیاں پالکیوں میں اور نوکریں، لونڈیاں رتھ منجھولیوں میں سوار ہو کر نواب وزیر کی حویلی میں پہنچگئیں

بیاہ بڑی دھوم دھام کا تھا۔ زنانہ میں امیر، غریب پانچ چھ ہزار عورتوں کا ہنگامہ تھا۔ صدر دالان میں بیگمیں، امیرزادیوں کی محفل تھی۔ ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا تھا۔ حسنی ڈومنی کی بیس برس کی عمر صورت بھی بہت دلربا تھی۔ گانا بھی بہت دلکش تھا۔ نرت خوب کرتی تھی محفل کو رچھا رہی تھی۔ اور انعام پر انعام پا رہی تھی۔

شاہ بانو اور لطف النساء گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی تھیں۔ سب گانا سننے میں محو تھے۔ اور لطف النساء کا سیدھا ہاتھ دوشالہ کے نیچے مرتبان کے اندر پڑا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ دو پھانکیں آم کے مربہ کی ایک ساتھ نکال کر کھاؤں۔ مگر مرتبان کا منہ چھوٹا تھا۔ اس لئے ایک پھانک بھی نہ نکلتی تھی۔

اور لطف النساء دانت پیس کر رہ جاتی تھی - یہاں تک کہ رات ہوئی - دسترخوان چنا گیا۔ سب مہمانوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد سونے کا مناسب انتظام ہوا۔ حسب حیثیت چھپرکھٹ - مسہریاں - اور پلنگ - چارپائیاں مہمانوں کو ملیں۔ اور سب سو رہے۔ ڈومنیاں صحن چبوترہ پر جو فرش تھا۔ اس پر ڈالی گئیں۔ مگر نیند بری بلا ہے۔ ان غریبوں کو چاندنی پر پڑ کر خبر نہ رہی۔ ایک نہ سوئیں تو لطف النساء وہ مربہ کھانے کی فکر میں تھیں۔ دو پھانکیں ایک ساتھ اٹک نہ نکلی تھیں۔ مگر موقع اب اچھا آگیا تھا۔ رات کے تین بجے تھے۔ سب گہری نیند میں مبتلا تھے۔ یہ اپنے پلنگ پر سے اٹھیں۔ مرتبان ان کے ہاتھ میں تھا۔ صحن چبوترہ پر ایک میر فرش انہیں دکھائی دیا۔ جو چاندنی پر رکھا تھا۔ انہوں نے فرش پر بیٹھ کر مرتبان میر فرش پر مارا۔ اور مرتبان دو ٹکڑے ہو گیا۔ اور تمام مربہ چاندنی پر گر گیا۔ یہ مربہ کی پھانکیں چن چن کر کھانے لگیں۔ مگر بی لطف النساء نے جسے پتھر کا میر فرش سمجھا تھا۔ وہ در اصل حسنیٰ ڈومنی کا سر تھا۔ شیشہ کے مرتبان کی سخت چوٹ سے وہ زخمی ہو گیا۔ اور حسنیٰ ڈومنی بھیانک آواز سے چیخی۔ جسے سن کر سارا محل جاگ اٹھا۔ روشنی تیز کی گئی۔ اور سب عورتوں نے دیکھا کہ حسنیٰ نامراد کے سر سے خون کے فوارے اڑ رہے ہیں۔ اور مغل کی ساس کچھ اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہے۔ ڈومنیوں نے کہا کہ لوگو! یہ مغل کی ساس ڈائن ہے حسنیٰ کا بھیجا کھا رہی ہے۔ وہ جب سے محفل میں آئی تھی۔ ہم دیکھتے تھے کہ وہ حسنیٰ کو گھورتی اور دانت پیستی تھی۔ درباریاں نے مردانہ میں نواب وزیر کو اور مرزا لنگڑے بیگ کو اس بات کی خبر

دی۔ نواب وزیر نے جراح کو حسنی کی مرہم پٹی کے لئے بلایا۔ اور مرتضےٰ بیگ شاہ بانو اور لطف النساء کو اسی وقت اپنے گھر لے آیا۔ صبح ہوتے ہی اس نے منجھولی میں بٹھا کر لطف النساء کو رتن پور چلتا کیا۔ اور یہ کہہ دیا ؎

بیک آمدن ربودی دل و دین و جان خسرو

چہ شود اگر بدیں سال دو سہ بار خواہی آمد

میرے ہاں اب کبھی تشریف نہ لایئے گا۔ گھر بیٹھے وظیفہ پایئے گا۔

(۳)

کہار۔ سواری اتروا لیجئے۔

آواز۔ کہاں کی سواری ہے۔

کہار۔ حضور رتن پور کی۔ یہ سننا تھا کہ جاہ بانو نے بیتاب ہو کر کہا۔ اماں جان آگئیں۔ اور وہ ڈیوڑھی کی طرف آئی۔ لطف النساء کو ڈولی سے اتار کر لے گئی اور دل کھول کر روئی دھوئی۔ دوپہر کے وقت سوداگر لطف النساء کا داماد بھی آیا۔ اور ساس کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لطف النساء نے بیٹی کو بڑے عیش میں پایا۔ سوداگر کی حویلی، دولت اور تجارت کے سامان سے کھچا کھچ بھر رہی تھی۔ سوداگر نے جاہ بانو سے کہا دیکھنا اماں جان کی دل و جان سے خدمت کرنا۔ اور خاطر تواضع میں کچھ اٹھا نہ رکھنا۔ دو مہینے لطف النساء کے گھر خیر سے گزر گئے۔ جو ایک دن سوداگر نے باہر سے لا کر ایک مرتبان اپنی بیوی کو دیکر اس سے کہا کہ لو یہ گاجر کا حلوہ ہے تم کبھی کھانا اور اماں جان کو بھی کھلانا۔ مگر اس میں دوائیں بھی ہیں۔ ذرا گرمی کرتا ہے۔ احتیاط سے کھانا۔

لطف النساء نے دوپہر کے وقت دستر خوان پر وہ حلوا کھایا تو بہت بھایا۔ شرم کے مارے بیٹی سے اور مانگا تو نہیں مگر اپنے دل سے کہا۔ دھیرا رہ چرا کھاؤنگی۔ اتفاقاً وہ مرتبان گودام کے کمرہ میں رکھا گیا۔ جس میں سوداگری کا سامان بھرا پڑا تھا۔ اور بی لطف النساء کا پلنگ بھی اسی میں بچھا تھا۔ رات کو جو یہ سوئیں تو بے کھٹکے مرتبان میں سے حلوہ نکال کر کھانا شروع کیا۔ اور مرتبان خالی کر دیا۔ آدھی پر دو بجے انہیں پائخانہ کی حاجت ہوئی۔ انہوں نے کمرہ کا دروازہ کھول کر نکلنا چاہا۔ مگر باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اور تقاضہ سخت تھا تسمع گل تھی۔ مگر کئی دن سے دیکھ رہی تھیں کہ طاق میں سوداگر کی مغلیہ ٹوپی رکھی ہے وہ اندھیرے میں انہیں مل گئی۔ اور انہوں نے اس سے طشت کا کام لیا۔ اب نجاست کے پھینکنے کی فکر ہوئی جو سامنے دیوار پر نظر پڑی اور تابدان میں سے چودھویں رات کی چاندنی آ رہی تھی۔ بڑی خوش ہوئیں۔ اور اپنے پلنگ پر چڑھ کر انہوں نے نجاست سے بھری ٹوپی تابدان سے پرے پھینکنی چاہی مگر جسے انہوں نے تابدان سمجھا تھا۔ وہ تابدان کا عکس تھا۔ جو چاندنی میں دیوار پر پڑ رہا تھا۔ تابدان دوسری طرف تھا۔ اس لئے ٹوپی نے دیوار سے ٹکر کھائی اور گندگی چھینٹ چھینٹ ہو کر دیوار پر اور چاروں طرف اڑی۔ الگنیوں پر دوشالوں کو، بڑی بی کے منہ کو، لحاف توشک کو، اور گودام کی اکثر چیزوں کو ناپاک کر دیا۔ بڑی بی نے دن میں بارہا دیکھا تھا کہ گودام میں کسی عرق کے بھرے قرابے اور شیشے رکھے ہیں۔ اس وقت اس یادداشت نے کام دیا۔ ایک قرابہ کھول کر اسی کے عرق سے اپنا منہ دھویا۔ اور پھر دیواریں اور دوشالے

سونگھ سونگھ کر عرق سے پاک گئے۔ اس میں صبح ہوگئی۔ ایک لونڈی نے
گودام کا دروازہ کھولا تو اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا ہے ہے بڑی
بیوی کا منہ کالا۔ اس صدا کو سُن کر جاہ بانو اور سوداگر دوڑا آیا۔ اور اس نے
دیکھا کالی روشنائی کے قرابہ اور شیشہ خالی پڑے ہیں۔ بی لطف النساء اور
دوشالہ اور تمام اسباب اور دیواریں گودام کی کالی ہو رہی ہیں۔ اور تمام کمرہ
بدبو سے سڑ رہا ہے۔ سوداگر نے اپنا یہ نقصان دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ جاہ بانو نے
ماں کو کھڑے کھڑے گھر سے نکال کر کہا "ناشدنی اب ہمارے ہاں کبھی نہ آنا۔"
اور لطف النساء گھر پہنچ گئیں۔

(۴)

کچھ دن بعد لطف النساء کی مامتا نے پھر اُسے اُبھارا اور شمشاد بانو
سے ملنے کے لئے بے چین ہو کر دلی پہنچی۔ بیٹی داماد بہت ادب سے پیش
آئے۔ حسین بخش بادشاہی باورچی تھا۔ اور نت نئے کھانے کھلاتا تھا۔
ایک دن بادشاہ نے حسین بخش سے فرمائش کی کہ شیرازی مزعفر تیار
کر کے دن کے کل دس بجے دسترخوان پر لگاؤ۔ اور وہ مزعفر کا سامان
بادشاہ کے ہاں سے گھر لے آیا۔ دیگیں اُس کے پاس رہتی تھیں۔ مزعفر
کی تیاری شروع کردی۔ حسین بخش اور شمشاد بانو نے دس بجے رات تک
اُسے لگا کر دیگ کو کمرہ میں رکھ لیا۔ تھوڑا سا خود بھی کھایا۔ تاکہ برائی بھلائی
اس کی معلوم ہو جائے۔ اور لطف النساء کو بھی چکھایا۔ اور لطف النساء نے
دل سے کہا "دھیرا رہ چرا کھاؤں گی۔" اور جب شمشاد بانو اور حسین بخش

سو رہے تو رات کو بارہ بجے اُن کی ساس نے دیگ کھولی۔ اور دیگ کے اوپر بیٹھ کر مزعفر کھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ صبح کے چار بج گئے اور بڑی بی کو ایک اسہال ہوا جس کی سخت آواز سے حسین بخش اور شمشاد بانو کی آنکھ کھل گئی اور دونوں کے دونوں یہ کہتے ہوئے بھاگے۔ غضب ہوا۔ بلی نے بادشاہی کھانے کو بگاڑ دیا۔ پاس جاکر معلوم ہوا کہ بڑی بی ہیں۔ اور دیگ پر بیٹھی ہیں۔ نجاست پیجامہ سے ٹپک ٹپک کر دیگ میں جارہی ہے۔ باورچی نے یہ تماشا دیکھ اپنے سر میں دو ہتڑ مار کر کہا۔ ہائے اماں جان آپ نے آج مجھے پھانسی پر چڑھایا۔ بیٹی نے ماں کو اسی حال میں گھر سے نکال کر کہا۔ دفان ہو غارتن۔ اب ہمارے گھر نہ آنا۔ اور لطف النساء رتن پور پہنچ گئی۔

:(۵):

چمیلی کی ٹہنی کی قلم بنائی۔ عرق گلاب اور کیوڑہ میں مشک عنبر کی سیاہی کاغذ کے بدلے ساذج ہندی اور اوراق گل لئے۔ کیونکہ میر عزت حسین بادشاہی خوشبو ساز کے گھر کا حال لکھنا ہے۔ یعنی پورے برس دن بعد بی لطف النساء کو پھر دلی یاد آئی۔ اور اپنی چھوٹی بیٹی سرو آزاد بانو کے ہاں پہنچ گئی۔ اور اس کے پاس رہنے لگی۔ مگر دل کی کلی نہ کھلتی تھی۔ کیونکہ اچھی چیز کھانے کو نہ ملتی تھی عطروں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ مگر عطر سے پیٹ نہیں بھرتا ہے۔ جوان کی خوش قسمتی سے میر صاحب نے پھولوں میں بسی بسائی دھوئی تلی اندر سے نکالی۔ کولہو میں سرشام ڈالی۔ اور بیل بھی کولہو میں جوت کر کھڑا کردیا تاکہ رات کے ایک دو بجے سے اُسے چلتا کردے۔ اور خوشبو کا تیل نکالے

دھوئی تلی پر لطف النساء کا دل آ گیا۔ اور اُس نے اپنے جی میں کہا۔ دھیا رہ جرا کھا نہ لگی" اور آدھی رات کو جب لڑکی داماد بے خبر سو گئے تو یہ کوہو کی کھپریل میں پہونچی۔ اور کوہو پر چڑھ دھوئی تلی کے پھنکے مارنے لگیں۔ کوہو کے بیل نے جو کوہو پر بڑی بی کو بیٹھا دیکھا تو وہ چل پڑا۔ اور چرخ چوں ہونے لگی دھوئی تلی کھاتے کھاتے بڑی بی کو بدہضمی ہوئی اور انہیں زور سے دست آیا۔ کوہو کی چرخ چوں سے عزت حسین اور سرو آزاد بانو کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے سمجھا بیل بے ہنکائے چل پڑا۔ بادشاہی تیل خراب ہوا۔ مگر معلوم ہوا کہ بی لطف النساء نے یہ کرتوت کیا ہے۔ میر صاحب نے کہا افسوس ملکہ کہا۔ سرکاری بڑا نقصان ہوا۔ دو برس میں دھوئی تلی بنی تھی۔ کیا جواب دونگا اور کیا منہ دکھاؤں گا۔

لطف النساء کو بیٹی نے فوراً گھر سے نکال دیا۔ اور رتن پور پہنچ کر وہ پھر کبھی دلی نہ آئی۔

یہ قصہ فرضی ہی سہی۔ مگر عبرت کے لئے اصلی ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ ان کثرت الاکل شومٌ۔ بہت سا کھانا نحس ہے۔
خدا معدہ کی آگ سے بچائے ؎

چو گرسنہ میشوی سگ میشوی
سخت ناہنجار و بدسگ میشوی

جہان آباد

جواب کا ہیکو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحبقران اپنے مرکب پر سوار دارالسلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکر لگا رہا تھا۔ جمعدار رکاب تھامے ساتھ تھا اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے۔ اس کوچہ کو کیا کہتے ہیں۔ یہ کون سا محلہ ہے۔ جمعدار جواب دیتا تھا۔ یہ پستہ شکن محلہ ہے۔ یہ گلی سراجوں کی کہلاتی ہے۔ یہ کوچہ روشن آباد ہے۔ چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا۔ اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑے جھاڑ رہے ہیں۔ اور دھول اُڑ رہی ہے۔ امیر نے پوچھا جمعدار یہ کیا جگہ ہے۔ جمعدار نے کہا حضور یہ کوچہ حضرت سید خواجہ بہاؤالدین نقشبند کا ہے۔ یہ بانسوں کے پھاٹک والی آپ کی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ مرید خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔ امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنے ہاتھ روک لئے تھے اور امیر اُن لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر۔ (نوجوانوں سے) تم ہمارا اصلا لحاظ نہ کرو۔ شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔"

آپ جانتے ہیں۔ مرید اور طالب علم اکثر ہوتے ہیں۔ نوجوانوں نے دری

کو اس زور سے ٹھنچارا کہ دھول کے مارے امیر کا ساز و یراق اور امیر کا چہرہ تاج گھوڑا وغیرہ سب اٹ گئے۔ امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر ملکر کہا "غبار المدینۃ شفاء" اور گھوڑے کو مہمیز کیا۔ اور یہ جا وہ جا۔

مریدوں نے خانقاہ میں آکر امیر کا سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا حضرت خواجہ سید بہاؤ الدین نقشبند نے کہا۔ لڑکو! کیا کہتے ہو کہ امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ پر مل گیا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ الٰہی اس ترک بچہ نے جس طرح تیرے رسولؐ کی ذریات کا ادب کیا ہے۔ اسی طرح اس کے بدلے ہیں اس کا نام شرق سے غرب تک شمال سے جنوب تک روشن کردے اس کی اولاد در اولاد کو پشتوں تک سلطنت بخشدے۔ چنانچہ امیر تیمور سے میران شاہ سلطان ابو سعید میرزا۔ سلطان محمد مرزا عمر شیخ میرزا بابر ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہاں تک گیارہویں سلطنت تھی۔

شاہجہان کو تعمیر کا دلی شوق تھا نئی دلی بسانے کی تدبیر شروع کی لال قلعہ اور اس کی اندرونی عمارتوں، اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے بنوائے گئے۔ شہنشاہ نقشوں میں بذات خاص اصلاح دیتے تھے۔ میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ تیار کیا۔ اور ملکوں ملکوں سے سنگ مرمر۔ سنگ سرخ سنگ سیاہ۔ سنگ باسی۔ اور ہزار ہزار قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے جتنیا اینٹ کا پیمانہ ایک ٹھیکیدار کو دیکر کہا۔ ایسی اینٹ تیار کرو۔ مگر اینٹ کچی نہ رہے۔ لاکھوری ہو۔ بادشاہی کام ہے دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا پیشگی نقد دلوایئے۔ میر عمارت نے لاکھ روپیہ کی چٹھی لکھدی۔ خزانہ سے فوراً

روپیہ پٹ گیا۔ اور ٹھیکیدار کام میں مشغول ہوگیا۔ اینٹوں کا پزاوہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت بعد میر عمارت کے پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا۔ اور کہنے لگا۔ میں تو برباد ہوگیا۔ پزاوں کی آنچ تیز ہوگئی۔ اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ اس بندہ کا زن بچہ کولھو میں پلوا دیگا۔ اس لئے میں بھاگتا ہوں۔ دیکھیئے یہ کھنگر ہے۔

میر عمارت۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اور قلم اٹھا کر اس نے ایک عرضی لکھکر بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جائیں گی۔ ان کی بنیادوں میں بجائے سنگ خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا۔ کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے۔ اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے۔ منظوری دیجائے۔ جواب آیا۔ کہ کھنگر کا بنوانا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظور مابدولت ہے۔ میر عمارت نے کہا۔ ٹھیکیدار ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا لو۔ اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو۔ اور نرا کھنگر پکاتے رہو۔ میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی یہ پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہوگیا۔ اور دل سے کام کرنے لگا۔ جب لال قلعہ کی نیو رکھنے لگے۔ تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبہ کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی۔ اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور سیگج کے ساتھ بنیادوں میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی ماش کا آٹا مردار سنگ، گوڑ۔ السی کا تیل سن مقرض ڈالکر بیل گری کا پانی چھان کر

دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا۔ اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ سفیدی جو در و دیوار پر لگا کر مہرہ کی جاتی تھی وہ احمد آباد۔ گجرات کے ایڈر نام پہاڑ کی کان سے آتی تھی۔ اس سفیدی کا یہ خاصہ تھا کہ جب اس کی گھوٹائی کی جاتی تھی۔ تو بلا مبالغہ چمک دمک میں جلبی آئینہ بن جاتی تھی۔ اور اس کے اندر آنکھوں کا سرمہ دکھائی دیتا تھا۔ دو سو برس تک آبدار رہتی تھی۔ لال قلعہ اور اس کے اندرونی مکان۔ قصر و ایوان بن رہے تھے تخت طاؤسی کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور معمار کاریگر خیموں میں۔ چھولداریوں میں۔ جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور ٹانکیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلہ پر ایک خیمہ خزانہ کا برپا تھا۔ ایک ہندو خزانچی اور تین محرر۔ دس سپاہی۔ روپیہ کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپیہ۔ اٹھنیاں۔ چونیاں۔ دونیاں۔ پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام اسامی میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چٹھہ بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ واجب الاداسمجھا جاتا تھا۔

لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اردو بازار ٹٹوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگا دیا گیا تھا جس میں جو گیہوں۔ جوار باجرہ کے آٹے سے لیکر قسم قسم کی جنس۔ کپڑا ترکاری۔ کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔ آگرہ سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر قسم کی دوکانیں

اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں۔ وہ تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیاء اور غذا انہیں میسر ہو۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصہ حصہ کر دیئے گئے۔ اور شاہجہان نے ان حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا۔ اور فرما دیا تھا کہ لاگت سب خزانہ سے ملے گی۔ اپنے اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنوالو تاکہ نیا شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے۔ چنانچہ دکن کا حصہ اورنگ زیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا کشمیری دروازہ کے قطع کو داراشکوہ نے فلک شکوہ قصر و ایوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا باغ اور گلشن اور حماموں سے رشک فردوس بنایا نثوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔ جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خاں وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھریں گئی تھیں۔ جو وہ انجنیر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکایک مع نقشہ کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام اینڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے حکم صادر ہوا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانہ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائیگا تو اسے اسقدر انعام دیا جائیگا۔ مگر وہ خدا کا بندہ ایسا الوپ ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال بعد وہ یکایک دربار شاہی میں حاضر ہو گیا۔ حضور والا نے فرمایا "کمبخت یہ حرکت کیا تھی"؟ اس نے ہاتھ باندھ کر کہا جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہوگی۔ نئی بنیاد پر ایسی اونچی عمارت کا لیجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیوں میں مرتا اور اس کے درو دیوار نیچے کھسکے اور ڈاٹیں۔ کمانیں۔ محرابیں۔ جھک جائیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی بھر جاتا اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برساتیں کھا کر نیو لوہا لاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ عمارت کھڑی ہوگی صدیوں تک کھڑی رہیگی۔ حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جاں بخشی ہو یا سزا دیجائے۔ بادشاہ نے انجنیر

کے عذر کو غور سے سنکر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں صاحب کے اہتمام سے تیار ہونے لگی۔ جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھارے۔ بہر حال جامع مسجد اور لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضور والا نے دیوان خاص میں تخت طاؤسی پر جلوہ افروز ہو کر جشن ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہاں آباد میں جو رعایا آباد کی گئی ہے۔ اس میں خوشحال کم اور اہل حاجت زیادہ ہیں۔ پھر ان میں کاروباری ہیں، مزدور ہیں۔ بیمار ہیں، عورتیں ہیں۔ پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر بھی باہر نہیں نکلتی ہیں۔ اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا ہے۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش گوشت فروش، میوہ فروش، پارچہ فروش، کسیرہ، گندھی، تانبے کے برتن فروش، موچی مٹی کے مٹکے، ٹھلیاں، صراحیاں بیچنے والے۔ اوپلہ ایندھن بیچنے والے۔ سادہ کار چاندی سونے کے زیور بیچنے والے۔ حلوائی۔ بساطی۔ اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر گٹھریوں میں کندھے پر رکھ کر، بہنگیوں میں کہاروں کے کندھے پر لاد کر گلی گلی کوچہ کوچہ محلہ محلہ پھریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لیکر آواز لگائیں۔ بزاز کہے "نینو ململ لٹھا۔ ڈوریہ ململ"۔ مچھلی والا" مچھلی دریاؤ کی، لو مچھ"، کھٹ بنے، بڑھئی، لوہار۔ اپنے اپنے پیشہ کا نام لیکر پکاریں۔ یہاں تک کہ موری دہلانے والے پکار کر کہیں "مہری دھلوا لیجئے" تاکہ گھر بیٹھے اہل حاجت کی ضرورت رفع ہو جائے۔ چونکہ اس حکم تازہ کی تعمیل مشکل سے پیشہ ور کرینگے اس لیئے کوتوالی کے برق انداز لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں گشت کروائیں۔ تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع اور مول لینے والوں کو بازار جانا نہ پڑے اور ہر قسم کی چیزیں اپنے دروازہ پہ لے لیں جیسی نیت ویسی برکت۔ شاہجہاں بادشاہ کی یہ تدابیر ایسی راست آئی کہ آج اس اجڑے دیار میں لینے والے بیٹی کا سارا جہیز اپنے گھر کے دروازہ پر

کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔ شاہجہاں کے بعد سلطنت درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی محمد شاہ رنگیلے تک پہنچی۔ اور لال قلعہ کا دیوان خاص عیش و نشاط کے سامانوں سے فردوس بریں بن گیا۔ معتمد الملک سید ہاشم علوی خاں حکیم رنگینی ذوق کے مددگار تھے ان کے حکم سے شتر خانہ بادشاہی میں گرمی جاڑہ برسات دو سو اونٹ بدمست رکھے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی دوا کے کام میں آتی تھی۔ میر شکار جنگلی کبوتروں کے بیس انڈے تازہ بتازہ اور بارہ انڈے چڑیا کے پیش کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی۔ ایک رات محمد شاہ نشہ کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے۔ جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ میں ہی تھی۔ اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو اور شاہجہاں آباد کو اجاڑ کر چل دیا۔ اور بقول مومن ؎

حسن روز افزوں پہ غرہ کس لئے ہے ماہ رو یوں ہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائیگا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ دانایانِ فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ کوئی حاکم کوئی رئیس کوئی نواب عہدہ برآنہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنایا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا؟ جان بچی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ ہندوستانی عموماً انہیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی بچہ بچہ کی زبان پر تعریف تھی یعنی فرنگیوں کی فوج جرار ہوتی ہے۔ دس ہزار پر ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک ان کی حکومت پہنچتی ہے پکی سڑک اور سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی اڑی چلی جاتی ہے اور تین تین دن میں خط پتر ملک کے

اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اس کا درماہہ یا طلب یا وظیفہ بے قیل و قال بے چون و چرا پہلی کی پہلی کو دیتے ہیں راجہ مہاراجہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی۔ اور نوکر کا گھرانہ کا گھرانہ فاقہ کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

(۸)

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے اور پھول والوں کی سیر منانے مہرولی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا۔ برکھا رت، ساون کا مہینہ۔ بادشاہی خیمہ مخملی بانانی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سوتی طنابوں سے جکڑے ہوئے کھڑے تھے ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ سے لیکر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں دو رویہ قنات کھڑی تھی کیونکہ ملکہ دوران میرزا جہانگیر کو لیکر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہونگی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے ظل سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔ بس ملکہ دوران نے پچاس خوان اندرسہ کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنہ، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولھا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی طرہ عطر میں بسا کر اس کے سر پر بند ہوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہکر بیگم نے رکھی اور بادشاہزادہ کی بلائیں لیکر کہا۔ "اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکلکر شاہجہاں آباد آئے اور میں تجھے دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جانِ من منت کی کشتی سنبھالکر اور سراد ب ... نیاز سے

جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آہ۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر اور صندل دان عطر دان بیگم نے اپنے سر پر اور مٹھائی کے خوان بادشاہزادوں نے اپنے سروں پر رکھکر سب نے مل جلکر آستانہ پاک کی راہ لی۔ بیگمیں بادشاہزادیاں تلواں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال کے سلمہ ستارہ کلابتون کے تمامی، زری بوٹی، زربفت کمخواب زری گاچھ اطلس دلدائی، باریٹ بنارس گجرات سورت احمدآباد شریف لاہور کے شاہی کارخانوں ریشمی اور زرین کپڑے کے لباس پہنکر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی، ڈھیلے پائنچوں کو دو لونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں، تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں۔ بیگموں کے جھانجھن چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندہ اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف میں پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دیئے گئے۔ ملکہ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچکر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا۔ مگر عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل چڑھایا۔ اور اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نقد نذرانہ چھری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہزادوں کو قدمبوس کرایا۔ اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر لپٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا۔ صحن میں کھم گڑے تھے۔ نوعمر بادشاہ زادیاں جھولے میں بیٹھیں۔ اور گائنیں اور انہیں جھلانے اور یہ غزل گانے لگیں

غزل

میری دل کی کنجی میر بجان جھولا　　　میری آرزو میرا ارمان جھولا

نہ جھولو بہت بھیگا جان جھولا ۔۔۔ کہ دیتا ہے آخر کو نقصان جھولا

کروں کیوں نہ آؤ بھگت اسکی دل سے ۔۔۔ برس دن میں آیا ہے مہمان جھولا

جو دیتی ہے جھونٹے کوئی لیے لیے ۔۔۔ اوڑاتا ہے کیا میرے اوسان جھولا

یہ برسات کے پانچ تحفے ہیں بیگم ۔۔۔ گھٹا۔ پھینیاں۔ آم پکوان جھولا

دوا تیری لڑکی بڑی بے حیا ہے ۔۔۔ نہیں چھوڑتی ہے کسی آن جھولا

رہے جا کے برسات میں قطب صاحب ۔۔۔ اگر جھولنا چاہے انسان جھولا

یہ موٹا یہ کھدی یہ میلا کچیلا ۔۔۔ کہاں سے اٹھا لایا دربان جھولا

خدا کے لئے آج پھر وہ سنا دو ۔۔۔ جو گایا تھا کل تم نے بی جان جھولا

ہوا ختم ساون لگا آج بجا دوں ۔۔۔ جھولاؤ گی کب تم چچی جان جھولا

اگر چاوڑی یا دریبہ کو جائیں ۔۔۔ مجھے لا کے دیں بھائی سلطان جھولا

بلایا ہے سمدھن کو جھولا جھلانے ۔۔۔ بنے گا نہ کیونکر پرستان جھولا

کنول دل کا کھلجائے ہو روح تازہ ۔۔۔ جھولائیں جو ملکہ خوش الحان جھولا

پھڑکتی ہے جب دیکھ لیتی ہے اسکو ۔۔۔ کروں اپنی بچی پہ قربان جھولا

یہ بہنوں سے میری ملاتا ہے مجھ کو ۔۔۔ بڑا مجھ پہ کرتا ہے احسان جھولا

تھکی جاتی ہوں میں تو پڑھتے ہی پڑھتے ۔۔۔ یہ ہے گیت یا کوئی دیوان جھولا

" " " اک ادا ہے یہ ہندوستان کی

نہ کیوں جھولیں ہندو مسلمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہو کر بادشاہ شاہجہاں آباد تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا کہ جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے۔ یہ رسم دلی سے مٹ گئی۔ اور نئی تانتی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے۔ اس لئے فقیر فراق تورہ کے معنی عرض کرتا ہے۔ تورہ ترکی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں۔ اس واسطے

دہلی میں محاورہ بنا۔ "شرع تورہ" یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنے میں استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً "اللہ رے عورت ترا تورہ" بوا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا۔ تورہ بیٹی۔

دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں۔ اور توران میں اس کھانے کے خوانوں کو کہتے ہیں۔ جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے تو ان کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام بنام، "تاکہ عین تاریخ پر تقریب میں ہلڑ نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دسترخوان پر نہ بٹھایا یا ہم دسترخوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں نے ہمارے آگے نہ تھی، ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خاندان میں بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں۔ تو وہ دسوں تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں۔ اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں۔ پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کر دی جاتی تھی۔ چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے توروں کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک تھیلی روپیہ کی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی، اس کے ذمہ پچاس تورہ ایک دن میں تقسیم کے لئے ہوتے۔ رسیدیں لیتا تھا، تورہ دیدیتا تھا۔ جو نقد لینا چاہتا اُسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہاری کی بہنگی میں ہوتا تھا۔ تورہ جو ادنیٰ قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی، تورہ کا کھانا مٹی کے لاکھی برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک لکڑی کے خوان میں سب سے نیچے:۔

(۱) باقرخانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد۔

(۲) قورمہ کے دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ۔

(۳) کباب شامی ۵ عدد
(۴) بریانی دو طباق
(۵) متنجن دو طباق
(۶) فیرینی دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر
(۷) مربہ آم وغیرہ کا ایک پیالی میں۔
(۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی۔
(۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ
(۱۰) گاؤ زبان دو عدد
(۱۱) گاؤ دیدہ دو عدد
(۱۲) نان تنور یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔

یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ مانڈہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے۔ جو شب برات کو پکتی ہیں۔

ایک مثل بھی مانڈوں کے متعلق مشہور ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

یہ معمولی تورہ ہے۔ ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزار نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا۔ اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے، اب تو پارٹی کی گرما گرمی ہے۔

ساقی
وہ نفیس مزاج حضرات جو اُردو ادب میں حسنِ کاری کے بہترین نمونے دیکھنا چاہتے ہیں
جو حسینِ الفاظ کی جادوگری سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں
جو ساغرِ ادب میں زندگی کی تلخ شراب چھلکتی دیکھنا چاہتے ہیں
جو مکروہ زندگی کو اس کی مکمل عریانی میں دیکھنا چاہتے ہیں
جو ایسا ادب دیکھنا چاہتے ہیں جس کا ہر لفظ دل کی طرح دھڑک رہا ہو
جس کے مطالعہ سے روح کی بےچینی سکون آشنا ہو جائے
جسے پڑھ کر آپ کے منہ سے بےساختہ کبھی آہ نکل جائے اور کبھی واہ
ایسا اعلےٰ درجے کا ادب
آپ کو صرف ساقی ہی میں مل سکتا ہے جو ادبِ جدید کا اُردو میں
واحد مصور ماہنامہ ہے
نمونہ کا پرچہ مفت طلب فرمائیں
منیجر ساقی - دہلی